محمد حمزہ فاروقی*

مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی کا اشتراکِ علمی

مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی میں استاد اور شاگرد کا تعلق تھا اور اس رشتے نے دونوں حضرات کو زندگی بھر کے لیے متاثر کیا۔ استاد ابتدا میں شاگرد کو تصنیف و تالیف کے بارے میں ہدایات دیتے رہے لیکن بعد میں سیرۃ النبیؐ کی تدوین و ترتیب اور تکمیل میں شاگرد کے تعاون کے خواہاں ہوئے۔ شاگرد کو استاد سے اس درجہ عقیدت تھی کہ انھوں نے نہ صرف استاد کے علمی مقاصد کی تکمیل کی بلکہ مکاتیبِ شبلی، حیاتِ شبلی اور مقالاتِ شبلی مرتب کر کے استاد کے نام کی حیاتِ جاودانی کا سامان کیا۔

ان دونوں شخصیتوں میں واضح فرق تھا جس کی بنا پر سید سلیمان ندوی، شبلی کی نسبت علمی دنیا میں زیادہ کامیاب رہے۔ دونوں کے علم و فن کا دائرہ متنوع اور وسیع تھا لیکن علمی گہرائی، تحقیق کے جدید انداز اور مغربی علوم تک رسائی میں شاگرد، استاد سے کہیں آگے نکل گئے۔ اس کی بہت سی مثالیں تھیں لیکن یہاں دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی کی تصنیف علم الکلام ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد آپ کی تصنیف الکلام ۱۹۰۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب قدیم علمِ کلام اور فکرِ اسلامی کی بارہ صدیوں کی منتخب اور اجمالی تاریخ تھی۔ شروع میں اختلافِ عقائد کی بحث تھی، پھر عہدِ عباسیہ میں عقلی علمِ کلام کی تدوین، ترویج اور مخالفت کی تاریخ بیان کی۔ دوسرے دور میں اشاعرہ، امام

بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

محمد حمزہ فاروقی

غزالی، امام رازی کے فکروفن سے بحث کی تھی۔ تیسرے دور میں ابن رشد، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا تذکرہ تھا۔ علامہ شبلی علم الکلام سے مطمئن نہ تھے۔ مولانا حمید الدین کو ایک خط میں لکھا، ''میں نے علم الکلام نہایت ناتمام لکھی اور درحقیقت میری تصانیف کا سب سے ناقص حصہ ہے''۔[۱] موضوع کی وسعت اور اسلامی دور کے متکلمین کے افکار و خیالات کو ایک مختصر کتاب میں سمونا ہی نقص کا ایک سبب تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ الکلام اور علم الکلام میں جہاں شبلی جمہورِ مسلمین سے اختلاف کرنے والے اہلِ فکر کی آرا تفصیل سے دے رہے تھے وہیں ایک آدھ مقام پر اہلِ فکر کی رائے اور شبلی کے خیالات اس طرح گھل مل گئے کہ کہ معترضین نے انھیں شبلی کے مذہبی افکار تصور کیا۔[۲] نتیجہ یہ ہوا کہ مئی ۱۹۱۴ء میں جب مولانا شبلی اور علماے دیوبند کا مناقشہ زوروں پر تھا تو دہلی میں مولانا عبدالحق حقانی نے الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارات کی من مانی توجیہ کرتے ہوئے مولانا شبلی کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کیا۔[۳]

مولانا شبلی مغربی خیالات سے واقف نہ تھے۔ انھوں نے مغربی افکار تک رسائی کے لیے مصری مصنف فرید وجدی پر انحصار کیا۔ فرید وجدی کی ادھ کچری معلومات جب الکلام اور علم الکلام میں ظاہر ہوئیں تو معترضین کو مولانا شبلی پر تنقید کا موقع ہاتھ آیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''ایک طالب علم'' کے پردے میں رہ کر جو مضامین الناظر لکھنؤ کے ۱۹۱۰ء کے مختلف شماروں میں لکھے وہ ''الکلام مؤلفہ مولانا شبلی پر تنقیدی نظر'' کے عنوان سے چھپے۔ یہ سلسلۂ مضامین مارچ ۱۹۱۰ء میں شروع ہوا تھا۔ مولانا دریابادی نے مارچ ۱۹۱۰ء کے شمارے میں تحریر کیا۔

> الکلام تصنیف تو درکنار صحیح معنوں میں تالیف بھی نہیں کہی جا سکتی بلکہ درحقیقت مصر کے ایک اہلِ قلم فرید وجدی کے خیالات کا اردو زبان میں خلاصہ ہے۔ ہمارے مولانا چونکہ یورپین زبانوں سے ناآشنا ہیں اس لیے انھوں نے یورپ کے متعلق اپنا تمام سرمایۂ معلومات فرید وجدی کے خزانۂ خیالات سے قرض لیا۔ افسوس ہے کہ مولانا نے انتخاب میں غلطی کی۔ فرید وجدی کو مذہبی جماعت میں خواہ کسی حیثیت سے علامہ تسلیم کیا جاتا ہے لیکن یورپ اور مشرق کے درمیان سفیر ہونے کی حیثیت سے وہ نہایت ناقابلِ اعتماد و غیر معتبر ہے۔[۴]

مولانا شبلی اس تنقید سے ناراض نہیں ہوئے۔ انھوں نے ''طالب علم'' کے پردے میں چھپے عبدالماجد کو پہچان لیا اور ۱۹۱۲ء میں جب آپ نے سیرتِ نبویؐ مرتب کرنی شروع کی تو انگریزی تصانیف سے معلومات اخذ کرنے کے لیے پچاس روپے ماہوار پر مولانا عبدالماجد کی خدمات حاصل کیں۔[۵]

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۳۲-۳۳ء میں خیام لکھی۔ اس تصنیف میں سید صاحب نے مغرب اور مشرق کے مآخذ سے استفادہ کیا۔ خیام کی رباعیات میں الحاقی عناصر کی نشان دہی کی اور مغربی دنیا نے جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں ان کا ازالہ کیا۔ آپ نے بنیادی مآخذ کی مدد سے خیام کی زندگی اور تصانیف کے وہ پہلو نمایاں کیے جو عوام اور خواص کی نظروں سے اوجھل تھے۔ مستشرقین نے خیام کے متعلق پروپیگنڈا کیا تھا کہ وہ شراب اور عورتوں کا رسیا تھا۔ اس کی رباعیات، جن میں الحاقی عناصر خاصی تعداد میں تھے، ان کے مطالعے سے اس تاثر کو فروغ ملتا تھا لیکن سید صاحب نے اس کے دیگر علمی کارنامے اور تصانیف دریافت کیں۔ خیام کے فلسفیانہ افکار سے بحث کرنے کے بعد سید صاحب نے اسے راسخ العقیدہ مسلمان عالم ثابت کیا۔ سید صاحب نے جس عرق ریزی سے مشرق و مغرب کے ''ماہرینِ خیام'' کا تجزیہ کیا اور نقد و تجزیہ کے بعد اصل خیام کو دریافت کیا اس میں حدیث سے وابستگی کا بھی دخل تھا اور استنباطِ نتائج میں روایت و درایت کے اصول استعمال کیے تھے اور تحقیق کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔

مولانا شبلی اگر غایت درجہ جذباتی اور ذکی الحس تھے تو ان کے برعکس سید سلیمان ندوی متحمل مزاج تھے۔ وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لیتے اور کسی جھگڑے میں الجھے بغیر مقاصدِ علمی کی تکمیل میں مصروف رہتے جب کہ شبلی میں رزم آرائی اور خود کو نمایاں رکھنے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ علی گڑھ کالج اور ندوۃ العلماء میں معاصرین اور شرکا سے الجھ گئے اور مخالفت کی انتہا کو چھو لیا۔ علی گڑھ کالج سے مستعفی ہونے کے بعد ان کا دعویٰ تھا کہ وہ جدید اور قدیم علوم کے ماہرین کو یکجا کریں گے۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کالج سے مستعفی ہوئے تو نظم اور نثر دونوں میں علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی۔ ۱۹۰۵ء میں جب آپ نے ندوۃ العلماء سے وابستگی اختیار کی تو اس کا محرک جدید و قدیم علوم کے

امتزاج کے علاوہ پسِ پردہ علما کی قیادت اور علی گڑھ تحریک کو نیچا دکھانے کی آرزو تھی۔

شبلی نے جب ندوۃ العلماء کی نظامتِ تعلیم قبول کی تو ان کے وجود سے ندوہ کو بہت سے فائدے پہنچے۔معیارِ تعلیم بلند ہوا۔نصاب میں انگریزی اور جدید علوم کا اضافہ ہوا۔ندوۃ العلماء کے لیے مختلف ریاستوں اور شخصیات نے چندے دیے جن کی مدد سے زمین خریدی گئی اور عمارات تعمیر کی گئیں۔ ندوہ کے سالانہ جلسوں میں مقتدر شخصیات شریک ہوئیں اور اس ادارے نے تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔اس کے ساتھ ہی مولانا شبلی کی تیز روی، مقاصد کے جلد پورا ہونے کی آرزو اور قدیم مکتبِ فکر کے علما کے مقابلے میں برتری کا احساس' شرکاے ندوہ کی رنجش اور مخالفت کے موجب بنے۔۱۹۱۲ء میں جب انھوں نے سیرتِ نبوی کے عظیم الشان منصوبے پر کام شروع کیا اور انھیں بھوپال اور حیدر آباد دکن کا مالی تعاون میسر آیا تو انھوں نے ارکانِ ندوہ سے آویزش کی راہ اپنائی اور بین الاقوامی اور مقامی سیاست میں دخل دینے لگے۔انھیں لیگ کی روش قابلِ اعتراض نظر آئی اور کانگرس کے مقاصد میں ملتِ اسلامیہ ہند کی فلاح نظر آئی۔گو انھیں سیاسیات کے بکھیڑوں میں الجھانے میں ابوالکلام آزاد کا زیادہ دخل تھا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سیرتِ نبوی کی تدوین کو زیادہ وقت نہ دے پائے اور ڈیڑھ جلد سے زیادہ نہ لکھ پائے۔جب انھیں اس زیاں کا احساس ہوا تو اس وقت عمر کی نقدی تمام ہونے والی تھی۔اس موقع پر انھوں نے رفقا کو جمع کیا اور دارالمصنفین اور شبلی اکیڈمی کی تاسیس کے لیے مالی انتظامات کیے۔

سید سلیمان ندوی ندوۃ العلماء کے ۱۹۰۰ء کے اجلاسِ پٹنہ سے بہت متاثر ہوئے۔اس وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی۔اس میں ملک کے ممتاز علما، مشائخ اور جدید تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے تھے۔ سید صاحب اس اجلاس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کئی مقامات پر اس کا ذکر کیا اور اسی اجلاس سے ان کے دل میں ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہوا۔اجلاس کے مقررین اور منتظمین میں جسٹس شرف الدین، سید علی امام، سید حسن امام، نصیر حسین بیرسٹر اور شیخ عبدالقادر قابلِ ذکر تھے۔اس اجلاس میں جدید و قدیم مکتبِ فکر کے افراد آنے والے دور کے مسائل کا حل دریافت کر رہے تھے۔اس وقت جدید اور قدیم میں اس قدر واضح تفریق نہ تھی جس کے مظاہر بعد کے دور میں نظر آئے۔سید حسن امام صاحب کی تقریر کے بے محل فقرے پر علمائے کرام ناراض ہوئے تو شاہ سلیمان پھلواری نے صورت

حال کو سنبھالا اور فرمایا کہ آج پہلا موقع ہے کہ نئے اور پرانے مل رہے ہیں۔ایک دوسرے سے شکوے ہو رہے ہیں، بدگمانیاں دور ہو رہی ہیں۔پھر ایک دو فقروں کے بعد حافظ کا یہ شعر پڑھا:

للہ الحمد میانِ من و او صلح فتاد
حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

اس اجلاس میں نصیر حسین بیرسٹر نے پر جوش و پر تاثیر تقریر کی۔عالم یہ تھا کہ صدر سے لے کر سامعین تک سب رو رہے تھے۔شاہ سلیمان پھلواری نے جب لوہا گرم دیکھا تو ندوہ کے لیے چندے کی اپیل کر دی، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔نصیر حسین صاحب نے اپنا کوٹ، ویسٹ کوٹ، گھڑی اور جو کچھ ان کی جیبوں میں تھا، ندوہ کی نذر کر دیا۔یہ دیکھتے ہوئے سلیمان شاہ پھلواری نے ایک شعر پڑھا جس کا ایک مصرع درج ذیل ہے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شدم

ہر طرف سے روپے، کپڑے، گھڑیاں اور زیورات برسنے لگے۔جلسے میں شاہ امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ بھی شریک ہوئے۔ان کے سر پر پیر کی دستار تھی۔جوش میں آ کر انھوں نے دستار اتار دی۔یہ دستار نیلام ہوئی تو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے اسے خرید لیا۔[6]

شیخ عبدالقادر نے قومی کتب خانہ کے قیام کی تجویز پر لکھی ہوئی تقریر پڑھی اور اپنی جادوبیانی سے مجمع کو مسحور کیا۔اسی جلسے میں شیخ صاحب نے مخزن کا اشتہار بھی پیش کیا جو اپریل ۱۹۰۱ء میں لاہور سے نکلنے والا تھا۔[7] شیخ صاحب کی دلچسپ تقریر نے سید صاحب کے دل میں فنِ تقریر کی جوت جگائی اور ندوۃ العلماء میں بطور طالب علم داخلہ لینے کی خواہش کو اکسایا۔[8]

ندوۃ العلماء کا ابتدائی تخیل مولانا سید محمد علی مونگیری نے ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیضِ عام کانپور کے سالانہ اجلاس میں پیش کیا تھا۔

۱۔ اس تحریک کی اساس علی گڑھ کی جدید تعلیم کے برخلاف دینی تعلیم تھی۔

۲۔ اس میں دینی علوم کے ساتھ حالاتِ زمانہ اور جدید دور کی مقتضیات سے واقفیت پر زور دیا گیا تھا۔

۳۔ تحریک کا مزاج سیاسی و ہنگامی کے بجائے علمی و فکری تھا۔

۴۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز اصلاح وترقی نصاب سے ہوا تھا، بالخصوص درسِ نظامی میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں لانے پر زور دیا گیا۔

۵۔ ندوۃ العلماء میں تجویز پیش کی گئی کہ ''انگریزی زبان اور بقدرِ ضرورت جدید علوم کو نصاب میں داخل کیا جائے اور ان کو دینیات اور عربی علوم وفنون کے ساتھ پڑھایا جائے''۔[9]

۱۲۷ کتوبر ۱۸۹۵ء کو ''انجمن آلِ ہاشم'' کا جلسہ کانپور میں ہوا۔ مولوی سید خلیل الرحمٰن رئیس نے جلسے کی صدارت کی۔ انجمن کے سیکریٹری مولانا سید عبدالحیٔ نے انجمن کے مقاصد بیان کیے۔ انھوں نے ایک دارالمطالعہ اور ندوۃ العلماء کے قیام کی تجویز پیش کی اور ''انجمن آلِ ہاشم'' کو ندوۃ العلما میں ضم کردیا۔[10] اس جلسے میں مولانا سید محمد علی، مولانا شبلی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا سید ظہور الاسلام، مولانا ابراہیم آروی، مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواری قابلِ ذکر تھے۔[11]

۲۵ دسمبر ۱۸۹۵ء کے جلسۂ انتظامیہ میں سید محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے اور مولانا سید عبدالحیٔ مددگار ناظم مقرر ہوئے۔ ندوۃ العلماء کا دفتر ۲ ستمبر ۱۸۹۸ء کو کانپور سے لکھنؤ منتقل ہوا۔ دارالعلوم ندوہ کا افتتاح شاہ نجم الدین فتح پوری کے ہاتھوں ہوا تھا۔ منشی احتشام علی کاکوری نے ایک عمارت ''خاتون منزل'' خرید کر دارالعلوم کے لیے وقف کردی۔ یہیں کتب خانہ بھی منتقل ہوگیا۔ عمارت حاصل ہوتے ہی ابتدائی درجات میں تعلیم کا آغاز ہوا۔[12] کانپور سے لکھنؤ دارالعلوم کی منتقلی کے محرک اور تجویز کنندہ شاہ سلیمان پھلواری تھے۔[13]

سید سلیمان ندوی فروری ۱۹۰۱ء میں دوسرے درجے میں داخل ہوئے۔ ان کے ماموں زاد بھائی سید نجم الہدیٰ بھی ان کے ساتھ دوسرے درجے میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں شعرو سخن کا دور دورہ تھا، اس ماحول سے سید صاحب بھی متاثر ہوئے۔ ندوہ میں ان کے ہم درس صدیق حسن مانک پوری تھے جو نبیرۂ امیر مینائی جلیل مانک پوری کے صاحبزادے تھے۔ ان کے زیرِ اثر سید سلیمان ندوی کا شاعری میں امیر مینائی کی طرف رجحان ہوا۔[14]

اس زمانے میں دوسرے درجے میں فقہ، فرائض، منطق اور حساب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تیسرے درجے میں فقہ اور منطق کے علاوہ ادب اور فلسفہ کی تعلیم دی جاتی۔ ان مدارج کی تعلیم مفتی

عبداللطیف سے متعلق تھی۔ چوتھے درجے میں منطق، فلسفہ، ادب، کے ساتھ حدیث کی تعلیم دی جاتی۔ اس کے اسباق مولانا حفیظ اللہ کے ذمہ تھے۔ چاروں درجوں کی تعلیم کی مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی نگرانی کرتے تھے۔ آپ منطق، ادب اور معقولات کے ماہر تھے اور سمجھانے کا انداز اس قدر دلنشین تھا کہ مشکل مسائل کو طلبہ کے لیے پانی کردیتے۔ انھوں نے سید سلیمان پر خاص توجہ کی۔ وہ مولانا شبلی کے بھی استاد رہے تھے۔ سید صاحب کے ایک استاد مولانا عبدالشکور مدیر النجم تھے۔[15]

سید سلیمان نے بچپن میں شاہ سلیمان پھلواری سے ابتدائی منطق کے اسباق پڑھے تھے، ۱۹۰۲ء میں جب شاہ سلیمان ندوۃ العلماء میں معتمدِ تعلیمات منتخب ہوئے اور لکھنؤ میں مستقل قیام فرمایا تو سید سلیمان ان کی حوصلہ افزائی کے سزاوار ٹھہرے اور شاہ سلیمان نے علمی ترقی میں سید سلیمان کی معاونت کی۔ اسی زمانے میں نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ کے معائنے کے لیے آئے تو شاہ سلیمان پھلواری نے سید سلیمان اور مولانا ظہور احمد وحشی کو امتحان کے لیے پیش کیا۔ سید سلیمان نے محسن الملک کی خدمت میں عربی میں قصیدہ پیش کیا لیکن نواب صاحب اس سے متاثر نہ ہوئے اور انھوں نے اس دور کے مشہور عربی اخبارات اللوا اور المؤید منگوائے۔ سید سلیمان نے انھیں نہ صرف پڑھا بلکہ اردو میں ترجمہ بھی کیا تو نواب صاحب بہت خوش ہوئے اور شاہ صاحب بھی بے حد محظوظ ہوئے۔ اس زمانے کے اخبارات وکیل، وطن اور کرزن گزٹ میں نواب صاحب کے معائنے کی کیفیت چھپوائی اور بطورِ خاص سید سلیمان ندوی کا ذکر کیا۔ ان کی تحریر کا ایک فقرہ یہ تھا کہ ''ملک وملت کی خدمت کے لیے اِن شاءاللہ صوبہ بہار ہر دور میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا''۔[16]

فروری ۱۹۰۲ء میں دارالعلوم ندوہ میں ابتدائی تین درجوں کے بعد چوتھا درجہ ''متوسط سال اول'' کے نام سے کھلا۔ جنوری ۱۹۰۳ء میں متوسط کے دوسرے درجے کا اور جنوری ۱۹۰۴ء میں متوسط کے تیسرے درجے کا افتتاح ہوا۔[17] مولانا شبلی نعمانی اکتوبر ۱۹۰۲ء میں امرتسر سے ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلماء میں ایک تقریر کی جس میں جدید اور قدیم دونوں گروہوں پر ندوہ کی ضرورت ثابت کی اور فرمایا کہ اب ایسی درس گاہ کی ضرورت تھی جو نیا علم الکلام پیدا کرے اور علما کو نئے علوم وفنون کی تعلیم دے۔ اس کے بعد آپ نے ''ختم نبوت'' کے موضوع پر تقریر کی۔ اسی موقعے پر علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی پہلی مرتبہ ملے۔[18]

سید محمد علی مونگیری نے ندوۃ العلماء کے اندرونی اختلافات سے تنگ آ کر ۱۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو نظامت سے استعفا دے دیا۔ ۴ جنوری ۱۹۰۴ء کے جلسے میں طے ہوا کہ ندوۃ العلماء کا دفتر شاہ جہاں پور منتقل کیا جائے۔ اسی دور میں رسالہ الندوہ اگست ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا۔ اس کا دفتر شاہ جہاں پور میں تھا اور رسالہ آگرہ کے مطبع مفید عام میں قادر علی خاں صوفی کے زیر اہتمام چھپتا تھا اور دفتر ندوۃ العلماء شاہ جہاں پور بھجوایا جاتا تھا۔ رسالے کے مدیر علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے اور مولانا سید عبدالحئی اس کے منیجر تھے۔[19]

۱۹۰۳ء میں ندوۃ العلماء کی انتظامیہ نے مولانا شبلی سے درخواست کی کہ وہ دارالعلوم کے معتمدِ تعلیم بن جائیں اور لکھنؤ میں قیام فرمائیں۔ مولانا شبلی جولائی یا اگست ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد دکن میں سر رشتۂ علوم وفنون سے وابستہ ہوئے تھے اور فروری ۱۹۰۵ء میں اس سے الگ ہوئے۔[20] ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی کی ندوہ سے بحیثیت ناظمِ تعلیم وابستگی اصلاحِ نصاب سے مشروط تھی۔ مدراس کے جنوری ۱۹۰۴ء کے اجلاس میں مولانا عبدالحئی ناظم ندوہ اور ملا عبدالقیوم حیدر آبادی پر مشتمل سب کمیٹی نے مولانا شبلی کی اکثر ترامیم منظور کرلیں اور ۱۹۰۵ء سے انگریزی کی تدریس طلبہ کے لیے لازم کردی گئی۔[21]

مولانا شبلی غضب کے مردم شناس تھے۔ وہ عام طلبہ پر ضرورت سے زیادہ توجہ نہ دیتے لیکن جن طلبہ میں علمی صلاحیت پاتے وہ التفاتِ خصوصی کے حق دار ٹھہرتے، انھیں تحریر وتقریر کی مشق کراتے، تحقیق کی رغبت دلاتے۔ انھوں نے مولوی ضیاء الحسن کو حیدر آباد دکن سے ۳جنوری ۱۹۰۴ء کو ایک خط میں لکھا:

> میں چاہتاہوں کہ چند روز تک آپ کا اور میرا ساتھ رہتا تاکہ میں ادب اور فلسفے کی بعض کتابیں آپ کو پڑھاتا اور مضمون نگاری کی تعلیم دیتا۔ دیکھیے کب خدا موقع لاتا ہے۔[22]

مولانا شبلی کو یہ خدا ساز موقع اپریل ۱۹۰۵ء میں میسر آیا جب آپ ناظم تعلیم بن کر ندوہ میں وارد ہوئے اور انھوں نے ضیاء الحسن اور سید سلیمان کو علم الکلام، معقولات اور اعجاز القرآن کے اسباق دینے شروع کیے۔ اسی دور میں مولانا ابوالکلام آزاد ندوہ میں شبلی کے پاس مقیم تھے۔ مولانا حمید الدین

فراہی مولانا شبلی سے ملنے آتے اور ہفتوں گھر کا راستہ بھول کر وہیں رہتے۔ وہ طلباے ندوہ کو جدید فلسفے اور قرآن کا سبق دیتے۔ ابوالکلام آزاد الندوہ کے مددگار ایڈیٹر تھے۔ بعد میں ندوۃ العلماء نے انھیں مجلسِ انتظامی کا رکن بنایا۔ مولانا عبداللہ عمادی مدیر البیان بھی لکھنؤ میں رہتے تھے اور اکثر مولانا شبلی کی علمی صحبتوں میں شریک ہوتے۔[23]

ضیاء الحسن علوی کے پاس مصر وشام کے عربی رسائل اور جدید تالیفات آتی تھیں۔ مولانا شبلی نے علوی اور سید سلیمان ندوی کو بعض مضامین کی تلخیص اور ترجمے کی ہدایت کی۔ سید صاحب نے جرجی زیدان کی تصنیف اللغۃ العربیۃ کا خلاصہ اور ترجمہ کیا جو مضمون کی شکل میں جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ میں شائع ہوا۔[24] سید سلیمان ندوی نے ۱۹۰۷ء میں رسمی تعلیم کی تکمیل کی۔ مارچ ۱۹۰۷ء میں رفاہِ عامہ لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا غلام محمد ہوشیار پوری نے کی۔ جلسے میں جدید وقدیم تعلیم یافتہ سب آئے تھے۔ مولانا شبلی نے موقعے کی مناسبت سے سید سلیمان ندوی اور ضیاء الحسن علوی کو تقاریر کے لیے تیار کیا۔ سید صاحب نے جدید اور قدیم علوم کے موازنے پر تقریر کی۔ اثنائے تقریر ایک صاحب نے اٹھ کر کہا کہ "اگر یہ تقریر عربی میں کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں گے"۔ مولانا شبلی نے مولانا سید عبدالحئی کی معرفت سید صاحب سے دریافت کیا کہ تم تقریر کرسکتے ہو؟ سید صاحب نے آمادگی کا اظہار کیا۔ خواجہ غلام الثقلین نے "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو" کا موضوع دیا۔ سید سلیمان نے فی البدیہہ تقریر کی اور سامعین کی داد وصول کی۔ مولانا شبلی نے جوشِ مسرت میں عمامہ سر سے اتار کر سید سلیمان کے سر پر باندھ دیا۔[25]

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اگست ۱۹۰۴ء میں علمی مجلّہ الندوہ جاری کیا اور مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو اس کی ادارت پر مامور کیا۔ جون ۱۹۰۵ء میں یہ رسالہ لکھنؤ کے عبدالعلی آسی کے مطبع "اصح المطابع" میں چھپنے لگا اور البیان کے مدیر عبداللہ عمادی اس کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک ابوالکلام آزاد اس کے نائب مدیر رہے۔ اس کے بعد آزاد امرتسر جا پہنچے اور وکیل کے مدیر مقرر ہوئے۔

آزاد کے جانے کے بعد الندوہ کی نائب ادارت کا بارِ امانت سید سلیمان ندوی کے کندھے

پر ڈالا گیا اور انھوں نے اس ذمہ داری کو مارچ ۱۹۰۸ء تک نبھایا۔ اپریل ۱۹۰۸ء سے جولائی ۱۹۰۸ء تک یہ رسالہ مولانا عبداللہ عمادی کی زیرِ ادارت رہا۔ اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک سید سلیمان ندوی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے مارچ ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک فرائضِ ادارت انجام دیے۔ سید سلیمان ندوی نے تیسری مرتبہ اگست ۱۹۱۱ء میں اس کی ادارت قبول کی اور مئی ۱۹۱۲ء تک وہ اس کے مدیر رہے تا آں کہ ندوۃ العلماء میں علما کی کش مکش رنگ لائی اور شبلی اور ان کے رفقا الندوہ سے دست کش ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ مولوی عبدالکریم اس کے مدیر ہوئے۔ ان کے بعد اکرام اللہ ندوی نے اس کی ادارت کی اور ۱۹۱۶ء میں یہ رسالہ فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ الندوہ کا علمی وقار جو شبلی، مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے رفقا نے قائم کیا ان کی رخصتی کے ساتھ ہی جاتا رہا۔[۲۶]

الندوہ کی ادارت مولانا شبلی اور مولانا شروانی کے پاس رہی لیکن اس کے نائب مدیر عموماً مولانا شبلی کے شاگرد ہوتے۔ شاگردوں کی حوصلہ افزائی، انشا پردازی کی مشق اور علمی و ادبی تربیت کے لیے مولانا شبلی ان سے مضامین لکھواتے اور رسالے میں شائع فرماتے۔ مولانا حمید الدین فراہی کی اقسام القرآن کا خلاصہ اپریل ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں شائع ہوا۔[۲۷] سید سلیمان ندوی کے مقالات ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں چھپتے رہے۔ سید صاحب نے مولانا شبلی کی رہنمائی میں تصنیفی مراحل طے کیے۔ رفتہ رفتہ مضامین میں سید صاحب کا اپنا رنگ نمایاں ہوتا گیا۔

مولانا شبلی جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں معتمدِ تعلیم مقرر ہوئے تو انھوں نے اصلاحِ نصاب اور معیارِ تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ندوہ کی وسعت و ترقی کے لیے مختلف ریاستوں اور شخصیات سے عطیات وصول کیے۔ ابتدا میں ندوۃ العلماء کی مستقل آمدنی نہ تھی، سالانہ جلسوں اور سفرا کے دوروں سے جو چندہ وصول ہوتا ان سے دارالعلوم کے اخراجات پورے کیے جاتے۔ ریاست حیدر آباد نے نواب وقارالامرا کے عہدِ وزارت میں نواب وقار نواز جنگ مولوی وحید الزماں کی کوشش سے ۱۹۰۰ء میں پچاس روپے ماہانہ دفترِ ندوہ کے لیے اور پچاس روپے ماہوار ناظمِ ندوہ سید محمد علی مونگیری کے لیے مقرر کیے تھے۔ ناظمِ ندوہ نے بکمالِ ایثار اپنا وظیفہ ندوہ کو منتقل کر دیا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں بہاولپور کے نواب بہاول خاں عباسی نے تین سو روپے سالانہ مدرسے کے غریب طلبہ کے لیے بطور امداد مخصوص کیے۔

ریاست بھوپال کے شعبۂ تعلیم میں منشی محمد امین ملازم تھے۔ یہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن سازشوں اور ریشہ دوانی میں مہارت رکھتے تھے۔ ان اوصاف کے باوجود مولانا شبلی کے دوست تھے اور ان کے علمی مقاصد سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ندوہ کی امداد کے لیے مولانا شبلی والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم سے ملیں۔ چنانچہ آپ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں والیہ صاحبہ سے ملے اور انھوں نے مولانا شبلی کی بھوپال میں موجودگی کے دوران نومبر ۱۹۰۵ء کو پچاس روپے ماہوار کی امداد جاری کر دی۔[۲۸] مولانا شبلی نے ۲ نومبر ۱۹۰۵ء کو مولانا حمید الدین فراہی کو خط میں لکھا۔

> ندوہ کے لیے بھوپال آیا تھا۔ سرکارِ عالیہ سے ملاقات کی اور ۵۰ روپے ماہوار ندوہ کے لیے انھوں نے مقرر فرما دیے۔ اب شاید بمبئی جاؤں، تیار رہو۔[۲۹]

مولانا شبلی نے ۷ فروری ۱۹۰۹ء کو ندوۃ العلماء میں خالص مذہبی علوم کے لیے مالی امداد میں اضافے کی درخواست کی۔ والیۂ بھوپال نے اس درخواست کو پذیرائی بخشی اور ماہوار امداد پچاس روپے سے بڑھا کر ڈھائی سو روپے ماہوار کر دی۔ مولانا شبلی نے سپاس گزاری میں ایک قصیدہ والیۂ بھوپال کی خدمت میں پیش کیا۔ مدحیہ قصیدے کا مطلع درج ذیل ہے:

> آنچہ دشت و چمن ابر بہاراں کردہ است
> خسروِ کشورِ بھوپال بما آں کردہ است[۳۰]

مولانا شبلی نے منشی امین زبیری کی تالیفِ قلب اور احساسِ ممنونیت کے زیرِ اثر لکھا:

> واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ اور ندوہ کو ریاست سے جو فوائد پہنچ رہے ہیں، اس کا سنگِ بنیاد آپ ہیں۔[۳۱]

۱۹۱۰ء میں نواب صاحب رامپور نے ندوۃ العلماء کو پانچ سو روپے سالانہ امداد دینے کا اعلان کیا۔ ندوہ کا مدرسہ لکھنؤ کی ایک پرانی عمارت میں تھا۔ اپریل ۱۹۰۷ء میں منتظمین ندوہ کی طرف سے ایک اپیل شائع ہوئی جس میں مدرسے کی نئی عمارت کا تخمینہ پچاس ہزار روپے لگایا گیا اور اعلان کیا گیا کہ اگر پچاس افراد ایک ایک ہزار روپیا بطور چندہ دیں تو یہ کام بآسانی مکمل کیا جا سکتا تھا۔ ندوہ کے

سفیر غلام محمد شملوی اپیل لے کر دربار بہاولپور میں حاضر ہوئے۔ نواب صاحب بہاولپور کی والدۂ ماجدہ نے فرمایا کہ ''اس رقم کے لیے پچاس اشخاص کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، ساری رقم میرے نج کے خزانے سے لی جائے۔'' رقم ملنے کے بعد قطعۂ زمین کی جستجو ہوئی۔ لکھنؤ کے حکام نے دریائے گومتی کے کنارے ایک خوش منظر و وسیع رقبۂ زمین برائے نام قیمت پر ندوۃ العلماء کو دے دیا۔ یوپی کے لفٹیننٹ گورنر نے ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو جلسۂ سنگِ بنیاد میں شرکت کی اور ندوۃ العلماء کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔[۳۲]

ندوۃ العلماء ایک دور میں حکومتِ برطانیہ کی نظروں میں مشتبہ ہو گیا تھا۔ اس ادارے کی ترقی اور بقا کے لیے حکومت کی نظرِ کرم لازمی تھی اس لیے مولانا شبلی اور منتظمین ندوہ حریت خواہی کے دعوے کے باوجود حکومت کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اس مرحلے پر نواب محسن الملک، جسٹس شرف الدین اور پٹیالہ کے وزیرِ خارجہ کرنل عبدالمجید خاں کام آئے اور انھوں نے انگریز حکام کے شبہات کو رفع کیا۔ اس اثنا میں مشیر حسین قدوائی نے ایک انگریزی اخبار میں خط لکھا کہ محکمۂ تعلیمات ندوۃ العلماء کو سرکاری امداد دے۔ قدوائی صاحب نے ۸ جنوری ۱۹۰۸ء کے انڈین ڈیلی ٹیلی گراف لکھنؤ میں حکومت کو توجہ دلائی تھی اور ۲۱ جنوری ۱۹۰۸ء کو ڈیلا خوس ڈائریکٹر تعلیمات کا مراسلہ قدوائی صاحب کو موصول ہوا اور انھوں نے قدوائی صاحب کو لکھا کہ اگر ندوہ کو امداد کی ضرورت ہے تو وہ براہِ راست حکومت کے پاس درخواست دے سکتا ہے۔ چنانچہ منتظمین ندوہ کی جانب سے ''مالی اور اعزازی'' امداد کی درخواست بھیجی گئی تو حکومت نے بلاشرط پانچ سو روپے ماہانہ کی امداد ۱۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو منظور کرنے کی اطلاع دی اور یہ وعدہ کیا کہ سرکاری محکمہ مدرسہ کے نصاب اور اصول میں کبھی مداخلت نہیں کرے گا اور اس کا روپیا ادبِ عربی، انگریزی اور ریاضی وغیرہ اور مدرسہ کی غیر مذہبی تعلیم پر صرف ہوگا۔[۳۳]

مولانا شبلی علی گڑھ میں اپنے شاگرد محمد علی سے ملنے بڑودہ گئے اور چند روز وہاں ٹھہرے۔ مولانا محمد علی نے علامہ شبلی سے درخواست کی کہ وہ اورنگ زیب عالم گیر پر انگریز اور ہندو مصنفین کے عائد کردہ الزامات کا رد پیش کریں۔ مولانا شبلی نے اس درخواست کو اس طرح پذیرائی بخشی کہ الندوہ

دسمبر ۱۹۰۶ء سے مارچ ۱۹۰۸ء تک چھے شماروں میں عالم گیر پر سلسلۂ مضامین لکھ کر دفاع کیا۔

انگلستان کا ایک مستشرق مارگولیتھ (۱۸۵۸ـ۱۹۴۰ء) نسلاً یہودی تھا لیکن بعد میں اس نے عیسائیت قبول کر لی۔ اس نے آنحضرتؐ کی سیرت لکھتے وقت خبثِ باطن اور تعصب کا مظاہرہ کیا تھا۔ بڑودہ کے قیام کے دوران مولانا محمد علی نے مارگولیتھ کی دریدہ دہنی سے علامہ شبلی کو آگاہ کیا اور قیامِ بڑودہ کے دوران سیرتِ نبویؐ لکھنے پر آمادہ کیا لیکن علامہ اس ارادے کو ۱۹۱۲ء میں روبہ عمل لا سکے۔[۳۴]

سید سلیمان ندوی ستمبر ۱۹۰۸ء سے مارچ ۱۹۰۹ء تک عربی انشا کے معلم رہے اور اپریل ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک نائب ادیب کی حیثیت سے ندوہ میں بحیثیت معلم متعین رہے۔ ۱۹۱۲ء میں جب مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ پر باضابطہ کام شروع کیا اور سیرت کا شعبہ قائم کر کے محققین کو بطور اسٹاف لیا تو سید صاحب بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ان کے ذمہ عربی بنیادی مآخذ سے سیرتِ نبوی کے لیے فراہمیِ مواد کا کام تھا۔ مثلاً صحیح بخاری میں سے سیرت کے واقعات کو یکجا کریں۔[۳۵]

اپریل ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں سید سلیمان ندوی کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر مقالہ شائع ہوا۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ ان کے رفقا نے مستقل کتاب لکھنے کا مطالبہ کیا۔ والیۂ ریاست بھوپال نے مولانا شبلی کے ذریعہ سیرتِ عائشہؓ مرتب کرنے پر معقول معاوضہ دینے کا وعدہ کیا۔ منشی محمد امین مہتمم صیغۂ تاریخ بھی اس تصنیف پر اصرار کرتے رہے۔ مولوی عزیز مرزا بھی مصر رہے۔ آخر سید صاحب نے ۲۲ جون ۱۹۱۴ء کو سیرتِ عائشہؓ پر کام شروع کیا اور ۱۹۲۰ء میں یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔ سید صاحب نے اس تصنیف کو بیگم سلطان جہاں سے منتسب کیا۔[۳۶]

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بعض امرا اور علما کے ذاتی کتب خانے ندوہ کی لائبریری میں شامل ہوتے رہے۔ شبلی کی ندوہ سے وابستگی سے قبل کتابوں کا ذخیرہ زیادہ نہ تھا۔ ندوہ کے سالانہ اجلاس ۱۸۹۹ء میں منعقدہ شاہ جہاں پور میں رئیس ڈپٹی مولوی عبدالرافع خاں نے اپنا موروثی کتب خانہ جس میں تین ہزار کتابیں تھیں ندوہ کی نذر کیا۔ ۱۹۰۰ء میں ندوہ کا پٹنہ میں اجلاس ہوا تو مولوی عبدالغنی وارثی نے اپنی کتابیں ندوہ کو دیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ لوگوں نے اپنی کتابیں ندوہ میں جمع کرائیں لیکن یہ قابلِ ذکر ذخیرۂ کتب نہ تھا۔ ندوۃ العلماء کی وسعت و ترقی کی مناسبت سے لائبریری میں کتابوں کا

اضافہ لازم تھا۔مولانا شبلی نے ۱۹۰۷ء میں اپنا کتب خانہ اعظم گڑھ سے لکھنؤ منتقل کیا اور ندوہ کے لیے وقف کر دیا۔اس میں تاریخ و ادب کا بڑا سرمایہ تھا اور مصر، شام اور ترکی اور یورپ کی نادر مطبوعات تھیں۔

مولانا شبلی کی تحریک پر جون ۱۹۰۷ء میں نواب سکندر نواز جنگ نے اپنی کتابیں ندوہ کی نذر کیں۔سید سلیمان ندوی پٹنہ سے ان کتابوں کو لکھنؤ لائے۔اسی سال شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر اور حکیم علی احمد نے اپنی کتابیں ندوہ کو دیں۔مارچ ۱۹۰۸ء جسٹس شرف الدین کا ذخیرۂ کتب ندوہ منتقل ہوا۔نواب صدیق حسن خاں کے نواسے سید مرتضٰی نے اپنے حصے کی کتابیں ندوہ کو دیں۔نواب عماد جنگ کا ذخیرہ، جس میں یورپی مطبوعات اچھی خاصی تعداد میں تھیں، اسی زمانے میں ندوہ آیا۔۱۹۱۰ء میں امیٹھی سے مولوی یوسف علی کا کتب خانہ، جس میں متعدد نایاب قلمی کتب تھیں، اور نواب علی حسن خاں کا کتب خانہ ندوہ آیا۔اس سے ایک دو سال قبل نواب صاحب کی بہن صفیہ بیگم کی کتابیں ندوہ کے کتب خانے میں داخل ہو چکی تھیں۔دہلی سے نواب سعید احمد خاں کی کتابیں آئیں۔ان کی اہمیت یہ تھی کہ ان کتابوں کی مدد سے ایلیٹ نے تاریخ ہند لکھی تھی۔[۳۷]

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے مارچ ۱۹۱۱ء میں اپنا ذخیرۂ کتب جس میں انگریزی اور عربی کتب خاصی تعداد میں تھیں، ندوہ کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کیا۔مولانا شبلی نے کتابیں حاصل کرنے کے لیے سید سلیمان ندوی کو بھیجا۔یہ سید صاحب کا حیدر آباد کا پہلا دورہ تھا اور آپ پہلی مرتبہ نواب عماد الملک سے ملے۔قیام مولوی عبدالغنی وارثی کے مکان پر تھا اور سید صاحب ایک ماہ تک ان کے مہمان رہے۔آپ روزانہ نواب صاحب کے ہاں جاتے۔نواب صاحب اپنے ہاتھوں سے کتابیں چھانٹتے اور سید صاحب انھیں رکھتے جاتے۔عطیات کے علاوہ مولانا شبلی نئی کتابیں بھی خریدتے تھے۔مصری رسائل میں کتابوں کی جو فہرستیں چھپتیں مولانا انھی میں سے کتابیں منتخب کر کے منگواتے۔[۳۸]

مولانا شبلی نے جنوری ۱۹۱۲ء میں ایک مضمون الندوہ میں لکھا جس میں سیرتِ نبوی پر لکھنے کا عزم ظاہر کیا۔مولانا جس رفیع الشان پیمانے پر سیرتِ نبوی پر لکھنا چاہتے تھے اس کام کے لیے معاون اسٹاف اور فراہمی سرمایہ دونوں لازمی تھے۔مولانا نے الندوہ میں قوم سے ماہانہ مصارف کے لیے ڈھائی

سو روپے اور خرید کتب کے لیے رقم کا مطالبہ کیا۔مولانا کی اس اپیل کا مسلمانوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔منشی محمد امین والیۂ بھوپال کے لٹریری سیکریٹری تھے، انھوں نے سلطان جہاں بیگم سے فرمایا۔"حضور! آج کونین کی دولت لٹ رہی ہے، آپ اس کو بڑھ کر کیوں نہیں اٹھا لیتیں۔یعنی ایک عاشقِ رسول مصنف گلے میں جھولی ڈال کر سیرتِ نبویؐ کی تصنیف کے لیے قوم سے بھیک مانگنے نکلا ہے، یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کر لیتیں اور اس فقیر کی جھولی میں ڈھائی سو ماہوار ڈال دیتیں کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جائے۔" یہ بات بیگم صاحبہ کے دل پر اثر کر گئی۔

منشی صاحب نے مولانا شبلی کو مطلع کیا اور اپریل ۱۹۱۲ء میں ان سے درخواست منگوائی۔ ۱۴ اپریل ۱۹۱۲ء کو دو برس کے لیے دو سو روپے ماہوار کے حساب سے وظیفہ منظور ہوا۔کتابوں کی خریداری کے لیے نوابزادہ حمید اللہ خاں کی جانب سے دو ہزار روپے منظور ہوئے۔[۳۹]

مولانا شبلی نے ۱۷ اپریل ۱۹۱۲ء کو منشی امین کو لکھا:

> ریاست کے عطیہ کی درخواست تو کی لیکن اب قبول کرتے ایک بڑا بار محسوس کرتا ہوں۔۔۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ کام کسی طرح دو برس میں انجام نہیں پا سکتا۔اس پر مستزاد یہ ہے کہ ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے اس لیے جلدی بھی کرتا ہوں کہ کچھ کر لوں ورنہ جس قدر میں کر سکتا ہوں اتنا کرنے والا بھی نظر نہیں آتا۔[۴۰]

مولانا شبلی نے ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء کو منشی امین زبیری کو لکھا:

> میرا ارادہ ہے کہ مستقل بمبئی میں قیام کر کے سیرت کو ختم کر دوں۔یہاں ہر روز ایک قصہ رہتا ہے اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔اسٹاف ساتھ لے جاؤں گا۔سید سلیمان ساتھ رہیں گے۔خوش نویس اور انگریزی مترجم وغیرہ بھی۔۔۔ ماہوار کے جاری ہونے پر یہاں سے روانگی موقوف ہے تاکہ اسٹاف کے لوگوں کو کافی اطمینان ہو جائے۔ماہواری چندے اور یک مشت رقمیں بہت سی آئیں، میں نے سب واپس کر دیں۔لوگوں کو شکایت ہے کہ اس سعادت میں ہم کو کیوں موقع نہیں دیا جا سکتا۔[۴۱]

مولانا شبلی اس وقت ندوۃ العلماء سے بے زار ہو رہے تھے۔شرکائے ندوہ کی رقابت مولانا کے لیے سوہانِ روح تھی۔بمبئی کی آب و ہوا اور ماحول انھیں پسند تھا۔مولانا شبلی مئی کے آخر میں بمبئی

جاتے ہوئے بھوپال ٹھہرے اور والیۂ بھوپال سے ملاقات کی اور مندرجہ ذیل قطعہ پڑھا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مولانا شبلی جون ۱۹۱۲ء میں بمبئی پہنچے اور سیرت نگاری شروع کر دی۔ سید سلیمان ندوی کو بمبئی بلوایا اور انھوں نے روایات کی تلاش اور رواۃ کے ناموں کی تحقیق میں مولانا کی مدد کی۔ آپ ستمبر ۱۹۱۲ء تک بمبئی میں رہے۔ سیرت النبیؐ کی جلد اول کے ۱۰۰ صفحات لکھے جا چکے تھے اور ۲ نومبر ۱۹۱۲ء تک ان پر نظر ثانی اور اضافہ ہوا تھا۔[۴۲]

مولانا شبلی نے ۲ نومبر ۱۹۱۲ء کو منشی امین زبیری کو لکھا:

سیرت کے ۱۰۰ صفحات ہو چکے تھے لیکن نظر ثانی میں پھر کچھ کا کچھ ہو گیا۔ یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے۔ ان کے ایک ایک حرف کے لیے سیکڑوں ورق الٹنے پڑتے ہیں۔ یہ کم بخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتا نہیں لکھتے۔ یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں۔[۴۳]

سیرت النبی کی ترتیب و تدوین میں کئی اصحاب علم شریک تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی انگریزی کتابوں سے معلومات اخذ کرنے پر مامور تھے اور پچاس روپے ماہانہ پاتے تھے۔[۴۴] ان کے علاوہ سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالباری ندوی اور مولانا حمید الدین فراہی، شبلی کی رہنمائی میں تالیف سیرت میں مصروف تھے۔ مولانا فراہی نے یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کے مناظرانہ مسائل اور قرآن پاک کے موضوعات پر مولانا شبلی کو مشورے دیے اور مدد کی۔ جلد اول کے مقدمے میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت اور قربانی کا باب مولانا فراہی کا تحریر کردہ تھا۔ بعد میں آپ نے اس پر مزید اضافے کیے اور الرائی الصحیح فی من ھو الذبیح کے عنوان سے الگ کتاب شائع کی۔[۴۵]

مولانا شبلی بمبئی سے نواب عماد الملک کی طلبی پر اکتوبر ۱۹۱۳ء میں حیدر آباد تشریف لائے۔ سرکارِ آصفیہ مولانا شبلی کو ۱۸۹۶ء سے سو روپے ماہوار وظیفہ دیتی تھی۔ نواب صاحب نے میر عثمان علی

خاں سے شبلی کے وظیفے میں اضافے کی سفارش کی، چنانچہ نظام دکن نے مولانا کا وظیفہ تین سو روپے ماہانہ کر دیا۔ اس طرح مولانا شبلی کو پیش نظر علمی کاموں میں سہولت حاصل ہوئی۔[۴۶] شبلی نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو منشی امین زبیری کے نام خط میں لکھا:

حیدر آباد نے (خود) میرے منصب میں دو سو کا اضافہ کر دیا۔ اب تین سو سکہ انگریزی ملیں گے۔ سیرت کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے پہلو بچایا کہ بھوپال کا تقدم اور یکتائی قائم رہے۔

مولانا شبلی نے حیدر آباد سے یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو منشی صاحب کو خط لکھا:

یہاں پہ دونوں اچھے بن گئے (سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی) کم بخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ بہر حال یہ طے ہو لے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کر دوں۔ ان شاء اللہ سیرت ہی کے کام کو اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے۔

مولانا شبلی نے ۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو منشی صاحب کو لکھا:

جناب پرنس حاجی حمید اللہ خاں صاحب نے مجھ کو لکھا ہے کہ سیرت کی مد کے استقبال کے لیے عید الاضحیٰ کی تعطیل میں حضور سرکار عالیہ کی خدمت میں گزارش کروں گا۔ موقع آ گیا ہے، آپ بھی یاددہانی کرا دیجیے۔ یہاں فی الجملہ طبیعت صحیح رہتی ہے۔ ارادہ ہے کہ جلد اول تمام کر کے یہاں سے اٹھوں۔ اسٹاف نہیں بلایا ہے۔[۴۷]

حیدر آباد میں مولانا شبلی کو نہایت پر فضا مقام پر کرایے کا مکان مل گیا تھا۔ یہاں وہ سیرت النبی جلد اول مکمل کر چکے تھے اور ان کا ارادہ اس منصوبے کو پانچ جلدوں میں مکمل کرنے کا تھا۔ شبلی ندوۃ العلماء سے باہمی کش مکش کی بنا پر جولائی ۱۹۱۳ء میں ناظم تعلیم کے عہدے سے مستعفی ہو گئے تھے۔ حیدر آباد میں مولانا دسمبر ۱۹۱۳ء تک رہے پھر سید سلیمان ندوی اور دیگر رفقا کے اصرار پر لکھنؤ آ گئے۔[۴۸]

سید سلیمان ندوی ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی کے اصرار پر ہفت روزہ الہلال کی مجلس ادارت سے وابستہ ہوئے۔ انھیں اسّی روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ سید صاحب نے ۲۸ جون ۱۹۵۲ء کو ظہیر احمد

صدیقی کے نام خط میں لکھا:

> اس زمانے میں الہـــــــلال ایک سیاسی بین الاسلامی تحریک سمجھی جاتی تھی اور مجھے حضرت الاستاذ مرحوم کی تربیت وصحبت میں اس سے دلچسپی تھی اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد کے کہنے سے میں مولانا شبلی صاحب کے پاس سے مولانا ابوالکلام کے پاس الہلال چلا آیا۔اس کا ذکر آپ کو مکاتیبِ شبلی میں ملے گا۔
>
> بہرحال چار پانچ ماہ ان کے ساتھ رہا۔میرے ہی ساتھ میرے دوست اور الـــنـدوہ، البیان اور وکیل کے سابق مدیر مولانا عبداللہ بھی الہلال میں آگئے۔وہ بھی چند ماہ رہے۔ہم لوگ کوشش کرتے تھے کہ تحریر میں ابوالکلام صاحب کے طرزِ تحریر کا اتباع کریں اس لیے الہلال میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ اسی رنگ میں لکھا جاتا تھا۔۔۔۔
>
> اسی درمیان میں مسجد کانپور کے واقعے کے زمانے میں ایڈیٹر صاحب کسی مصلحت سے مہینے دو مہینے کے لیے مسوری تشریف لے گئے۔ان کی غیر حاضری میں میری اور عمادی صاحب کی تحریریں ان کے نوٹ کے بغیر شائع ہوئیں۔ان تحریروں میں "مشہد اکبر" "تذکارِ نزولِ قرآن" "قصصِ بنی اسرائیل" وغیرہ مضامین میرے ہیں۔۔۔۔
>
> حریت اسلام کے سلسلے میں اسلام کے نظامِ سیاسی کا مضمون میں نے لکھا تھا جو اس سے پہلے الـــنــدوہ میں "اسلام اور اشتراکیت" کے عنوان سے چھپ چکا تھا۔اس کو دوبارہ الہـــــــلال کے رنگ میں لکھا۔مولانا نے اس میں انقلابِ فرانس وغیرہ کے مسائل کا اضافہ فرمایا ہے۔اسی طرح دوسرا مضمون "تاریخِ حبشہ کے چند گم شدہ اوراق" میرا مضمون ہے جو مقریزی کے رسالے کی تلخیص ہے،اس میں بھی مولانا نے کچھ دخل در معقولات کر کے شائع کیا۔اسی طرح "کشفِ بیان"، "اسوۂ نوحی" اور "اسوۂ ابراہیمی" وغیرہ مضامین عمادی صاحب کے ہیں۔"الحرب فی القرآن یا فی الاسلام" کا مضمون عبدالسلام صاحب کا ہے۔"انسانیت موت کے دروازے پر" غالباً عبدالرزاق ملیح آبادی کا مضمون ہے مگر ناشرین نے ان سب کو ابوالکلام کے نام سے شائع کیا ہے۔[۴۹]

شبلی نعمانی نے سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی کو خطوں میں ہدایات دیں تھیں کہ مضامین اپنے نام سے لکھیں "ورنہ تمھاری زندگی پر بالکل پردہ پڑ جائے گا اور آیندہ ترقیوں کے لیے مضر

ہوگا"۔[۵۰]

مولانا شبلی نے ۱۶ ستمبر ۱۹۱۳ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھا:

> الہ آباد گورنمنٹ نے الہـــــلال کا پرچہ "مشہد کانپور" قابلِ ضبطی قرار دیا ہے اور حسن نظامی کا پمفلٹ بھی۔[۵۱]

مولانا شبلی کو یہ علم نہ تھا کہ "مشہد کانپور" کا لیڈنگ آرٹیکل سید سلیمان ندوی کا تحریر کردہ تھا۔ حکومت نے اس کی اشاعت پر دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی تھی۔سید سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد کا الہلال میں اشتراک چار پانچ ماہ سے زیادہ نہ چل سکا۔اس کا بنیادی سبب اختلافِ طبائع تھا۔مولانا ابوالکلام آزاد کے مزاج میں انانیت اس قدر راسخ تھی کہ وہ اپنی زبان اور قلم کو آوازۂ حق اور دعوتِ حق تصور کرتے تھے۔

سید سلیمان ندوی نے شریعت اور طریقت کے سرچشمے سے ہدایت پائی تھی۔انھوں نے دینی علوم کی تکمیل کے بعد اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو ان سے خلافت پائی۔[۵۲] تصوف نے سید صاحب کی طبیعت میں اعتدال اور نرمی پیدا کی تھی۔ سید صاحب ہنگامی سیاست اور صحافت کے لیے موزوں نہ تھے۔ان کا مزاج علمی تھا اس لیے وہ مولانا آزاد کا زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکے اور دسمبر ۱۹۱۳ء میں الہلال سے مستعفی ہو کر لکھنؤ آ گئے۔

مولانا شبلی نعمانی کے دوست شیخ عبدالقادر دکن کالج میں السنۂ شرقیہ کے پروفیسر تھے۔آپ نے شیخ صاحب سے سفارش کی کہ سید سلیمان ندوی کو دکن کالج میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی تقرری میں مدد دیں۔قیامِ لکھنؤ کے دوران سید صاحب کو بمبئی گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کا خط ملا جس میں آپ کو اطلاع دی گئی تھی کہ انھیں دکن کالج میں سو روپے ماہانہ تنخواہ اور دس روپے سالانہ ترقی پر اسسٹنٹ پروفیسر برائے فارسی کی آسامی پر متعین کیا گیا۔لکھنؤ میں سید صاحب شبلی کے ساتھ ایک ہفتہ رہے اور ۲ جنوری ۱۹۱۴ء کو پونا روانہ ہو گئے۔سید صاحب نے پونا میں ملازمت اس لیے قبول کی کہ یہاں انھیں علمی کاموں کے لیے فرصت میسر آئی۔[۵۳] مولانا شبلی نے ۷ جنوری ۱۹۱۴ء کو سید سلیمان کو خط میں لکھا:

> پروفیسر صاحب نے تم پر مجھ پر دونوں پر احسان کیا ہے۔ ان کو عربی صرف و نحو پڑھا دو، صرف ضروری مسائل جس سے عبارت پڑھنا آجائے، پھر ادب کی ضروری کتابیں۔[54]

دکن کالج کے پرنسپل اور چار پانچ لیکچرر یورپی تھے۔ سید سلیمان شیخ عبدالقادر کے بنگلے کے نزدیک ایک چھوٹی سی بنگلیا میں ٹھہرے اور شیخ صاحب کے مہمان بنے۔ سید صاحب نے شیخ صاحب کو عربی سکھائی اور بعد میں آپ عربوں سے مل کر زبان دانی کی مشق کرتے رہے۔ پونا میں رہ کر سید صاحب نے انگریزی پر عبور حاصل کیا اور یہودیوں سے عبرانی سیکھی، یہیں رہ کر آپ نے ۱۹۱۵ء میں ارض القرآن لکھی۔[55]

مولانا شبلی اپنے کمالاتِ علمی اور شخصی روابط کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۵ء میں سب علمی آستانوں سے منہ موڑ کر اور کشتیاں جلا کر ندوۃ العلماء کے آستانے میں بیٹھنے کا عزم کیا اور بقیہ زندگی ندوہ کے مقاصد کی تکمیل کا تہیہ کیا لیکن یہاں انھیں کچھ دشواریاں پیش آئیں۔ شبلی میں روشن خیالی، علمیت اور وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ علما کی قیادت اور عوام کی سیادت کا جذبہ نمایاں تھا۔ سرسید کے مذہبی خیالات عامۃ الناس میں مقبول نہ تھے۔ مولانا شبلی یہ داعیہ لے کر اُٹھے کہ وہ قدیم مکتبۂ فکر کے علما اور جدید تعلیم یافتہ افراد کو یکجا کر دیں گے لیکن پس پردہ علی گڑھ تحریک کو نیچا دکھانے کی آرزو تھی۔ علی گڑھ کالج سے وابستہ حضرات مثلاً محسن الملک اور نواب وقار الملک دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بھی ہمدرد اور خیر خواہ تھے اور ندوہ کی ترقی میں مقدور بھر مدد دیتے تھے۔ مولانا شبلی، سرسید سے فیض پانے والے اور علی گڑھ کالج سے برسوں سے وابستہ رہے تھے لیکن نثر اور نظم میں اسے برا بھلا کہنے سے چوکتے نہ تھے۔

ندوۃ العلماء کے بانیوں نے دارالعلوم کے طلبہ کی تعلیم و تربیت اس جذبے سے کی تھی کہ وہ روشن دماغی، وسعتِ نظر اور دینی قیادت کے ساتھ سیرت و اخلاق اور تعلق باللہ میں لوگوں کے لیے نمونہ بنیں۔ ندوہ کے منتظمین پر مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے روحانی اثرات تھے۔ مولانا شبلی کو روحانی ماحول میں رہنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ عالم ہونے کے ساتھ شاعر اور رنگین مزاج تھے۔ ندوہ کے منتظمین

کو شبلی کی تصانیف الکلام اور علم الکلام پر اعتراضات تھے۔ ان حضرات کو شبلی کی وقت کی پابندی اور ملاقاتوں سے وقتِ مقررہ سے قبل نہ ملنا بھی کھٹکتا تھا۔ پرانے منتظمین کے نزدیک مولانا شبلی کے انداز و اطوار پسندیدہ نہ تھے۔ ان میں روحانیت اور تصوف سے لگاؤ نہ تھا جو ابتدائی دور کے ندوۃ العلماء کے بانیوں کا خاصہ رہا تھا۔ وہ مولانا شبلی کی طلبہ سے تعلیم اور صحبت کو نقصان رساں تصور کرتے تھے اور ان کے نزدیک طلبہ میں مذہبی شعائر کا احترام باقی نہ رہا تھا۔ ان باتوں سے مولانا شبلی اور دیگر ارکان و معتمدین ندوہ کے درمیان اعتماد و تعاون کی فضا برقرار نہ رہ سکی۔[56] ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ کی کارروائیوں کے رجسٹر میں ۲۴ جولائی ۱۹۱۰ء کے جلسے کی روداد میں درج تھا:

> مولانا خلیل الرحمٰن صاحب نے شکایت کی کہ مولانا شبلی صاحب کی معتمدی سے پہلے دارالعلوم میں دینی رجحان زیادہ تھا، اس میں کمزوری پیدا ہوگئی۔ مولانا خلیل الرحمٰن نے معتمد کی تبدیلی کا مشورہ دیا۔[57]

۲۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دارالعلوم ندوہ میں ہڑتال ہوئی۔ بالآخر ارکانِ انتظامیہ کی باہمی کش مکش کا خاتمہ ریاست پٹیالہ کے وزیر خارجہ کرنل عبدالمجید خاں کی مداخلت کے ذریعے ہوا اور انھوں نے مولانا شبلی اور دیگر ارکانِ انتظامیہ میں میل کرا دیا۔ ظاہری مصالحت کے باوجود دلوں کی بدگمانی اور شک کی چنگاریاں وقتاً فوقتاً سلگتی رہیں۔ ان کے اختلاف کا ایک سبب مولانا شبلی اور دیگر ارکانِ ندوہ کا سماجی پس منظر تھا۔ مولانا شبلی کا تعلق رئیس گھرانے سے تھا اور وہ نفیس و پر آسائش زندگی کے عادی رہے تھے جب کہ دیگر شرکائے کار متوسط یا نچلے متوسط طبقات سے وابستہ رہے تھے۔ اس کے علاوہ شبلی علی گڑھ میں رہ کر فکر و نظر کے انقلاب سے روشناس ہوئے تھے، اس سے ان کے معاصرین ندوہ نا آشنا تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ مولانا شبلی کے اختلافات مولانا سید عبدالحئی، مولانا خلیل الرحمٰن اور دیگر رفقا سے نمایاں ہوتے گئے۔

مولوی عبدالکریم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فقیہِ اول کے عہدے پر ملازم تھے۔ مولانا شبلی نے جب مئی ۱۹۱۲ء میں الندوہ کی ادارت سے استعفا دیا تو نائب ناظم نے مولوی عبدالکریم کو الندوہ کا مدیر مقرر کیا۔ انھوں نے جون ۱۹۱۲ء میں جہاد کے فضائل و مناقب پر طویل مضمون لکھ کر پرچے میں شائع

کیا۔مضمون کی اشاعت سے حکومتِ برطانیہ کی ناراضگی کا اندیشہ ہوا۔مولانا شبلی نے ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء کو معتمدین اور مقامی ارکان کو بلا کر صورتِ حال پیش کی اور متفقہ رائے سے مولوی عبدالکریم معطل کر دیے گئے۔

مخالفین نے اخبارات میں شور مچایا تو اس مضمون کے متعلق متعدد ارکانِ ندوہ نے اظہار برأت کیا۔آخر چند دیگر ارکان نے ۹ مارچ ۱۹۱۳ء کے جلسۂ انتظامیہ میں قانونی سقم کی بنیاد پر معطلی کا حکم منسوخ کر دیا۔اس کے بعد منشی احتشام علی اور ان کے ساتھی کمشنر سے ملے تو انھوں نے کہا کہ ایڈیٹر کو کچھ نہ کچھ تنبیہہ ضروری تھی۔چنانچہ منشی صاحب نے ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو ارکان کے نام خطوط جاری کیے اور مولوی عبدالکریم چھے ماہ کے لیے معطل کر دیے گئے۔اس پوری کارروائی کو بعض لوگوں نے مولانا شبلی سے منسوب کیا، حال آنکہ شبلی کا اس میں دخل نہ تھا۔مسلم گزٹ لکھنؤ کے مدیر مولوی وحیدالدین سلیم، شبلی کے خلاف پروپیگنڈے میں پیش پیش تھے۔[۵۸]

مولانا شبلی اس صورتِ حال سے اس قدر بد دل ہوئے کہ انھوں نے جولائی ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے معتمدی سے استعفا بھیج دیا۔ان کے ساتھ ہی مولوی سید عبدالحئی اور منشی احتشام علی بھی معتمدی سے مستعفی ہو گئے۔۱۸، ۱۹ اور ۲۰ جولائی ۱۹۱۳ء کے جلسۂ انتظامیہ میں مولانا خلیل الرحمٰن مستقل ناظم بنائے گئے۔مولوی سید عبدالحئی اور منشی احتشام علی نائب ناظم مقرر کیے گئے۔مولانا شبلی کے استعفے پر طلبہ نے کئی تار بمبئی بھیجے جن میں استعفا واپس لینے پر زور دیا تھا لیکن مولانا راضی نہ ہوئے۔انھوں نے رکنِ ندوہ کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کا وعدہ کیا۔طلبہ اور رفقا کے اصرار پر آپ ۸ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ تشریف لائے اور مارچ ۱۹۱۴ء تک یہاں رہے اور طلبہ کو درس دیتے رہے۔[۵۹]

دسمبر ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے طلبائے ندوہ کو بعد نمازِ مغرب بخاری شریف کا درس دینا شروع کیا۔بہت سے طلبہ اس درس میں شریک ہوتے تھے لیکن ناظم صاحب نے اسے پسند نہ کیا۔انھوں نے مہتمم اور مدرسِ اعلیٰ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کے ذریعے درسِ حدیث بند کروانا چاہا لیکن انھیں اس میں تامل تھا۔بعد میں ناظم کے زور دینے پر مفتی صاحب نے طلبہ پر فارغ اوقات میں کسی سے بھی درس لینے کی ممانعت کر دی۔طلبہ فارغ اوقات میں دوسروں سے اپنے سابق درس کی کمی پورا کرتے تھے،وہ سب بند

ہو گئے۔

دارالعلوم ندوہ کے طلبہ نے مولانا شبلی سے درخواست کی کہ وہ سیرتِ نبویؐ پر تقریر کریں، یہاں بھی منتظمین ندوہ ان کے آڑے آئے لیکن بعد میں بدنامی کے ڈر سے چند قیود اور شرائط کے ساتھ اس کی منظوری دی گئی۔ان واقعات نے طلبہ کو اس قدر مشتعل کیا کہ انھوں نے ۷ مارچ ۱۹۱۴ء کو اسٹرائک کر دی۔مسعود علی ندوی اعلیٰ درجے کے منتظم لیکن ''لٹھ مار'' طبیعت کے مالک تھے۔انھوں نے ندوہ کے طلبائے قدیم کی بنا ڈالی اور اس کے پہلے ناظم منتخب ہوئے۔انھوں نے ہڑتال کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا اور سو سے زائد طلبہ کے طعام و قیام اور تدریس کا بندوبست کیا اور دوسری طرف اخبارات،رسائل اور پمفلٹوں کے ذریعے احتجاج کے شعلوں کو ہوا دیتے رہے۔[۶۰]

اخبارات اور رسائل نے اسٹرائک کو خوب اچھالا۔ہمدرد دہلی،مسلم گزٹ لکھنؤ، زمیندار لاہور اور الہلال کلکتہ کے صفحات طلبہ کی ہمدردی کے لیے وقف تھے اور مولانا شبلی کی مجروح انا کو سہارا دے رہے تھے۔ملک میں جا بجا جلسے ہو رہے تھے جن میں ندوہ میں اصلاحات پر زور دیا جا رہا تھا۔مولانا ابوالکلام آزاد رائی کا پربت بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔ان کے آتش ریز و طوفان خیز قلم نے یہ ثابت کیا کہ اس وقت ملتِ اسلامیہ کو درپیش مسائل کا حل ندوہ کی اصلاح پر موقوف تھا جس کی راہ میں چند قدامت پسند علما حائل تھے۔

ندوہ کے طلبائے قدیم کی مجلس کو مولانا شبلی آشیر باد میسر تھی۔مولانا خلیل الرحمٰن نے انتظامی جلسے میں دو خطوط پیش کیے۔پہلا خط عبدالسلام ندوی کا مسعود علی ندوی کے نام تھا اور دوسرا خط مولانا شبلی نے مسعود علی ندوی کو لکھا تھا۔ان دونوں خطوط نے اسٹرائک کے اخلاقی پہلو اور مولانا شبلی کی حیثیت کو مجروح کیا۔[۶۱] اس دوران میں مولانا شبلی نے نواب سید علی حسن خاں،ابوالکلام آزاد،مسعود علی ندوی اور سید سلیمان ندوی کو متعدد خطوط لکھے اور ندوہ میں اصلاحات پر زور دیا۔مولانا شبلی نے اپریل ۱۹۱۴ء میں مسعود علی ندوی کو لکھا۔

> جلسہ میں عبدالسلام اور میرے خطوط غلط یا صحیح پڑھے گئے۔پھر کیوں کر ممکن ہے کہ وہ درج کارروائی نہ ہو اور اس سے یہ لوگ سازش کا کام نہ لیں۔ان لوگوں نے تمام خرابیوں اور اسٹرائک کے سارے زور کو صرف سازش اور میری شرکت کے ادعا سے

ٹھنڈا کردینا چاہا ہے اور البشیر وغیرہ بھی اثر ملک میں پھیلا دیں گے۔[۶۲]

مولانا شبلی کے حامیوں میں نواب سید علی حسن خاں، ابوالکلام آزاد، خواجہ غلام الثقلین، میرزا حیرت اور جالب دہلوی نمایاں تھے جب کہ ندوہ میں اسٹرائک کے مخالفین مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولوی عبدالحق حقانی، شاہ سلیمان پھلواری، دیوبند کے مولانا محمود حسن، حاجی محمد اسحٰق خاں، نواب زادہ آفتاب احمد خاں قابلِ ذکر تھے۔ دیوبند اور علی گڑھ کے منتظمین اس بنا پر اسٹرائک کے مخالف تھے کہ اگر یہ بدعت پھیل گئی تو دیگر مدارس کو نقصان پہنچے گا۔ علما نے عام طور پر یہ فتویٰ دیا کہ اسٹرائک ناجائز تھی۔ عبدالباری ندوی نے جب الہلال میں اس کے جواز میں سلسلۂ مضامین شروع کیا تو مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کی تردید میں مضمون لکھا۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اسٹرائک کے خلاف مضامین لکھے۔ اس اسٹرائک سے مولانا شبلی کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا۔[۶۳] مولانا شبلی نے مسعود علی ندوی کو اپریل ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھا:

> میں بار بار روکتا تھا کہ اسٹرائک سے کیا نتیجہ ہوگا لیکن آخر ہوئی اور لطف یہ کہ اس کی اتنی قیمت ٹھہری کہ میری سازش تھی۔
>
> مجلسِ انتظامیہ اپنی رپورٹ شائع کرے گی۔ بڑے بڑے نام ہیں، اس کے مقابلے میں بے چارے بچوں کی قیادت ہوگی۔۔۔۔۔ غریب لڑکے کیوں کر بسر کرتے ہیں اور کب تک کریں گے؟ مکان کون سا ہے؟ وہ بھی تو خالی کرایا جائے گا۔[۶۴]

ندوہ میں اسٹرائک ڈھائی ماہ تک جاری رہی۔ دہلی میں مجلسِ اصلاحِ ندوہ کا اجلاس مولانا ثناء اللہ امرتسری کی زیرِ صدارت ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کو ہوا جس میں مولانا شبلی کے موافقین و مخالفین دونوں شریک ہوئے۔ مجلسِ اصلاحِ ندوہ اپریل ۱۹۱۴ء میں قائم ہوئی۔ نواب سید علی حسن خاں اس کے ناظم اور مولوی نظام الدین حسن اس کے صدر قرار پائے۔ بہت سے حضرات نے اس کی رکنیت قبول کی اور ملک بھر میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔

اس اثنا میں مولانا عبدالحق حقانی نے الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارات کی بنا پر مولانا شبلی کی تکفیر کا فتویٰ جاری کیا۔ سید عبدالسلام صاحب مالک مطبع فاروقی نے شبلی سے سوال کیا کہ

"آپ مادۂ عالم کو قدیم اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں؟" مولانا شبلی نے جواب دیا کہ "میں مادۂ عالم کو قدیم نہیں مانتا، البتہ تمام صفاتِ الٰہی کے قدم کا قائل ہوں اور اسی طرح نبوت کو اکتسابی بھی نہیں جانتا بلکہ اس کو عطیۂ الٰہی مانتا ہوں۔" مولانا شبلی نے ایک طویل بیان دیا اور ایک مختصر تحریر دی تھی۔ سید سلیمان ندوی نے دونوں تحریریں اپنے پاس رکھ لیں اور مختصر تحریر سید عبدالسلام کے سپرد کی جو عام طور سے شائع کی گئی اور تکفیر کے فتنے کا سدباب کیا گیا۔

۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کے جلسے کے دوران مسعود علی ندوی اور سید سلیمان ندوی مولانا محمد علی سے ملے اور انھیں طلبہ کے مطالبات کی حمایت پر آمادہ کرنا چاہا۔ انھوں نے فرمایا "جب تک طلبہ اسٹرائک نہ ختم کردیں، میں ان کی حمایت نہیں کرسکتا"۔ مسعود اور سید سلیمان نے کہا، "اگر آپ ان کے مطالبات کی ذمہ داری قبول کرلیں تو امید ہے کہ وہ ابھی اسٹرائک ختم کردیں"۔ مولانا محمد علی یہ سن کر خوش ہوئے۔ ان دونوں حضرات نے لکھنؤ تار دیا جس کا طلبہ کی جانب سے جواب آیا۔ "ہم بخوشی اپنی قسمت کی باگ آپ کے مضبوط ہاتھوں میں دیتے ہیں اور آپ کے حسبِ مشورہ اسٹرائک ختم کرتے ہیں"۔ مولانا محمد علی اس کا نامے سے بہت خوش ہوئے۔[۶۵]

۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کے جلسے میں حکیم اجمل خاں کے ایما پر ایک سب کمیٹی بنی جس کا کام ندوہ کے لیے نیا دستور العمل بنانا تھا۔ اس کانفرنس میں مولانا محمد علی نے یہ طے کیا کہ پچھلے واقعات پر تنقید کرکے کش مکش کو طول نہ دیا جائے بلکہ آئندہ کے لیے جمہور کی قوت بڑھائی جائے اور ایسے قاعدے جاری کیے جائیں جن سے منتظمینِ ندوہ کو خودمختارانہ کارروائی کا موقع نہ ملے۔ سب کمیٹی کے سربراہ پیر زادہ محمد حسین تھے اور اور حکیم اجمل خاں، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، ثناء اللہ امرتسری، خواجہ غلام الثقلین، نواب سید علی حسن خاں اور حکیم عبدالولی ارکان منتخب ہوئے۔ ۲۴ مئی ۱۹۱۴ء کو سب کمیٹی نے اصلاحات کا خاکہ پیش کیا۔ وسطِ جون میں مولانا شبلی بمبئی تشریف لے گئے اور سیرۃ النبیؐ کی تصنیف میں مصروف ہوگئے۔[۶۶]

جس زمانے میں ندوۃ العلماء کے منتظمین اور مولانا شبلی کی مناقشت زوروں پر تھی تو حیدرآباد کے سوا دوسری ریاستوں نے ندوہ کی امداد روک دی تھی اور حکومتِ ہند کے محکمۂ تعلیم نے بھی سخت

اعتراضات کیے تھے۔اس وقت صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے تحقیقات کے لیے ایک وفد بھجوانے کی تجویز پیش کی تا کہ ندوہ کی مسدود امداد دوبارہ جاری ہو سکے۔ یہ امر مولانا شبلی کو ناگوار گذرا کیوں کہ امداد کے دوبارہ اجرا سے ندوہ کے منتظمین کے ہاتھ مضبوط ہو سکتے تھے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جنھیں شبلی ''اغیار'' قرار دیتے تھے، عوام میں سرخرو ہو سکتی تھی۔ مولانا نے اس پر ''ندوۃ العلما اور محکمۂ معائنۂ اغیار'' نامی طویل نظم کہی۔ اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آتا ہے اب معائنہ ندوہ کا مشن جو اختراعِ مجمعِ حکمت شعار ہے
جن میں سے کچھ شریکِ نزاعِ قدیم ہیں کچھ ابتدائے بانیٔ آغازِ کار ہے
جن میں سے کوئی محکمۂ راز کا شریک مضمونِ آفتاب کا مضموں نگار ہے
کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوۂ علوم جو مدعیٔ رہبریٔ روزگار ہے
جو مایۂ امید ہے نسلِ جدید کا جو کاروانِ رفتہ کی اک یادگار ہے
جس پر یہ حسنِ ظن ہے کہ مجمعِ کرام جس کا مصر و شام میں اب تک وقار ہے
آیا تھا جس کے شوق میں وہ فاضلِ عرب جس کا مرقعِ ادبی المنار ہے
جس نے بدل دیا روش و شیوۂ قدیم یہ انقلابِ گردشِ لیل و نہار ہے
آئے ہیں اس کی جانچ کو ناآشنائے فن جو رہبرِ طریقۂ اصلاحِ کار ہے
تعلیمِ مشرقی سے نہیں جن کو کچھ غرض ندوہ اب ان کا نازکشِ اقتدار ہے

مولانا شبلی جوشِ رقابت میں جسے ''ناآشنائے فن'' اور ''رہبرِ طریقۂ اصلاحِ کار'' قرار دے رہے تھے وہی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ندوہ کے تنِ خستہ میں امداد کا جرعۂ حیات آفریں انڈیلنا چاہتے تھے، ورنہ مولانا شبلی اور ان کے ''لٹھ مار'' رفقا نے ندوۃ العلما کی بربادی میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ ''لٹھ مار'' ان معنوں میں کہ بعض حضرات مولانا شبلی کی حمایت میں مفروضہ دشمنوں کی سرکوبی کے لیے قلم کو لاٹھی کی طرح چلاتے تھے۔ ۱۹۱۲ء سے جو اسلامی ہند میں انقلاب آیا تو ندوہ مولانا شبلی کے ہاتھ سے نکل گیا اور حریت خواہی میں بھی علی گڑھ کے منتظمین بازی لے گئے جنھیں مولانا شبلی کا رخانۂ غلامی کی پیداوار کہتے تھے۔[۶۷] مولانا شبلی نے اس کا اعتراف یکم مارچ ۱۹۱۳ء کے خط بنام عبدالباری ندوی میں کیا تھا۔

علی گڑھ کے لڑکے اب ہم لوگوں سے بھی آگے ہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کی حالت

شوریدگی تک پہنچ گئی ہے۔آزاد (ابوالکلام) وہاں جائیں تو لڑکے ان کی گاڑی کھینچیں۔[۶۸]

مولانا شبلی بمبئی میں ۱۹ جولائی ۱۹۱۴ء تک رہے اور اپنے بھائی مولوی محمد اسحٰق کی بیماری کی اطلاع ملتے ہی الٰہ آباد چلے گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۱۴ء کو ان کے بھائی فوت ہوگئے۔ مولانا شبلی کے تمام پروگرام تلپٹ ہوگئے اور صدمے کے عالم میں انھوں نے معین الدین ندوی کو ۱۴ اگست ۱۹۱۴ء کو لکھا:

جو مصیبت مجھ پر پڑی شاید تمھیں معلوم نہیں۔ عزیز بھائی اسحٰق نے جو میرا دست و بازو تھا، انتقال کیا۔ میں مدت تک کسی کام کے قابل نہیں رہا۔[۶۹]

مولانا شبلی کی ایک عرصے سے ''دارالمصنفین'' اور ''دارالتکمیل'' جیسے ادارے قائم کرنے کی خواہش تھی۔ مولوی محمد اسحٰق کے انتقال کے بعد انھوں نے اعظم گڑھ کو اپنا مستقر بنایا اور تن دہی سے اپنے منصوبوں کی تکمیل میں مصروف ہوگئے۔ مولانا شبلی کو اس زمانے میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر کا انتظام اور شبلی اسکول جو مولانا شبلی کی غیر موجودگی میں روبہ تنزل تھا، اسے دوبارہ ترقی کی راہ پر ڈالنے کی فکر تھی۔ انھوں نے اپنے آئندہ عزائم کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ۱۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھا:

بہرحال میں اعظم گڑھ چلا آیا۔ مجھ ٰن شبلی اسکول، جو ۲۰ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا، ہائی اسکول سے مڈل اسکول تک آگیا۔ عزیز مرحوم (مولوی محمد اسحٰق) اس کو انٹرنس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنا چاہتے تھے۔ دو مہینے کا دورہ رکھا تھا اور پانچ سو روپے مصارفِ دورہ کے لیے الگ کر دیے تھے۔ اشتہارات اور رسیدیں یہاں سب چھپ گئی تھیں۔
مجھ کو اس کام کے علاوہ ''دارالمصنفین'' اور ''دارالتکمیل'' کی فکر ہے۔ ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا۔ ۱۴ برس تک کشاکش میں گذرے۔ جو ہوگیا وہ تعجب انگیز ہے۔ بہرحال صورتِ موجودہ یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ گیارہ بگھہ پختہ ہے۔ اس کو وقف کر رہا ہوں اور شرکا بھی راضی ہوگئے ہیں۔ مسودہ لکھا جا چکا، رجسٹری کرانا ہے۔ دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں۔ کتب خانہ (دوبارہ) معتدبہ مہیا ہوگیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ دفترِ سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل

ہوجائے گا بلکہ صرف کتب خانہ کے لیے کافی ہوگا اور دارالمصنفین کے لیے کچھ اضافہ ہوگا۔ چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے چار عناصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں۔ چندہ مشروط نہیں، ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ دارالتکمیل کھول رہا ہوں۔ یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبہ کو تیار کروں۔ وہ مددگار ہوں گے۔ انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا۔۔۔۔۔ نواب عمادالملک نے دارالمصنفین کی صدرنشینی قبول کرلی ہے۔ تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے۔[۷۰]

مولانا شبلی نے ۱۸ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مسعود علی ندوی کو لکھا:

مکان۔۔۔۔۔والد مرحوم کا خالی ہے، یعنی میں نے کرایہ سے روک رکھا ہے اور اس کا کرایہ اپنے ذمہ لے لیا ہے کیوں کہ وہ مکان والد نے مظفر کو دے دیا تھا۔ وہ مکان نہایت کافی ہے۔ طلبا دارالتصنیف اور دارالتکمیل کے لیے بھی اس میں کافی جگہ ہے۔ میرے بنگلے اور نیشنل اسکول سے بھی قریب ہے۔

لیکن اصل سوال تمہارے الاؤنس کا ہے۔ جو کام تم سے متعلق ہوگا اس کے لیے ضرورت ہے کہ تمہاری پوزیشن معزز ہو اس لیے یا تو معاوضہ معقول ہو جس کی نسبت ابھی کوئی اطمینان کے قابل انتظام نہیں، یا اگر آنریری کام کرو تو مصارف کا بار پڑے گا، اگرچہ مکان مفت کا ہوگا اور دیگر مصارف بھی بہت کم، تاہم آخر مصارف ہوں گے۔

میرے پاس اس وقت صرف بھوپال کی ماہوار اور اپنا ذاتی وظیفہ ہے۔ دارالمصنفین کے لیے کئی برس بعد آمدنی کی صورت نکلے گی۔ وظائفِ تکمیل کا کسی قدر انتظام یوں ہوا ہے کہ تیس روپے ماہوار میاں حمید دیں گے، اسی قدر ایک اور صاحب۔ کتب خانہ بنگلہ باغ کی وسعت اور ترمیم میں بہت مصارف پڑ رہے ہیں اور پڑیں گے اور یہ سب اپنی ذات سے کر رہا ہوں اور کرنا پڑے گا۔[۷۱]

مولانا شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مولانا شبلی کے متعلق لکھا:

بعد وفات علامہ مرحوم معلوم ہوا کہ بنگلہ اور باغ از روئے وصیت وقف کردیا ہے اور بلند حوصلہ اعزہ تکمیل وصیت پر آمادہ ہیں۔ قبر اسی باغ میں بنی اور وہیں تکمیل سیرت کے سامان ہورہے ہیں۔[۷۲]

مولانا شبلی نے ۵ ستمبر ۱۹۱۴ء کو سید سلیمان ندوی کو اطلاع دی:

چونکہ خاندان کے اور لوگ شریک ہیں اس لیے ان کو بھی وقف پر آمادہ کر رہا ہوں۔ پندرہ بیگھہ خام کا رقبہ ہے اسی میں نیشنل اسکول بھی آجائے گا۔

مولانا شبلی نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھا:

تمھارا بہت انتظار رہا۔ مسعود آئے بھی اور چلے گئے۔ وہ تو اس ویرانے کو علمی کوششوں کی جولان گاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں۔ کتابیں بقدرِ ضرورت مہیا ہوگئی ہیں۔ چھے سات الماریاں بھر گئی ہیں۔ وقف نامۂ باغ زیر تحریر ہے۔ بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دارالضیوف بن گیا ہے۔ غالباً تم کو تکلیف نہ ہوگی لیکن آؤ تو چند روز ٹھہرو۔ پادر رکاب آنا پسند نہیں۔ شاید اس وقت تک مسعود دوبارہ آئیں۔ علی محسن وغیرہ امتحان کے بعد آئیں گے۔[۷۳]

مولانا شبلی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو، جب آپ اپنی صحت کی طرف سے مایوس ہوگئے تھے اور منزلِ آخر قریب نظر آرہی تھی، مولانا حمید الدین فراہی کو خط میں لکھا:

افسوس کہ کہ سیرت پوری نہ ہوسکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کرے۔ وقف نامہ میں اسٹامپ کا جھگڑا تھا اس لیے کلکٹر کے یہاں درخواست دے دی۔ وہ طے کردیں تو تکمیل ہوجائے۔ تم کو متولیوں میں رکھا ہے اور اگر دارالمصنفین قائم ہوجائے تو تمھارے سوا کون چلائے گا۔[۷۴]

مرض الموت کے دوران مولانا شبلی کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ عمر کی نقدی تمام ہونے والی تھی اور سیرتِ نبوی کی تالیف ادھوری رہ گئی۔ اپنی کوتاہی پر انھیں افسوس تو تھا لیکن ان کی امیدوں کا محور ان کے شاگرد تھے جو ان کے بعد سیرتِ نبویؐ کی تکمیل کرسکیں اور دارالمصنفین کے منصوبے کو روبہ عمل لاسکیں۔ انتقال سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو مندرجہ ذیل تار دلوایا۔

اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرتِ نبویؐ کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا ورنہ سب کارروائی بے کار ہو جائے گی۔ سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔[۷۵]

مولانا شبلی نے سیرتِ نبویؐ کے مسودے اور مبیضے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کرا دیے اور عزیزوں کو وصیت فرمائی کہ "یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کیے جائیں اور ان کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں"۔ وفات سے تین روز قبل سید سلیمان ندوی اور مولانا حمید الدین کو تار دلوائے۔ سید صاحب تار ملتے سے پہلے پونا سے روانہ ہو گئے اور ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو اعظم گڑھ پہنچے۔ مرض کی شدت کی بنا پر شبلی میں تابِ گویائی نہ تھی۔ لوگوں نے جواہر مہرہ پانی میں گھول کر پلایا تو توانائی بحال ہوئی اور آپ نے سید سلیمان کا ہاتھ تھام کر فرمایا۔ "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو"۔ سید صاحب نے جواب دیا۔ "ضرور، ضرور"۔

مولانا حمید الدین فراہی ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کی شام کو اعظم گڑھ پہنچے تو مولانا شبلی کی حالت اور بھی ردی ہو چکی تھی۔ ۱۷ نومبر کی صبح کو مولانا شبلی نے سید سلیمان اور حمید الدین سے فرمایا۔ "سیرت، سیرت، سیرت، سب کام چھوڑ کے"۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی انتقال کر گئے۔[۷۶]

مولانا شبلی کے انتقال کے بعد ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو آپ کے تلامذہ اور رفقا جمع ہوئے اور ایک مختصر سی "جماعت نعمانیہ" بنائی جس نے شبلی کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل کو اپنا مقصد قرار دیا۔ مدرسہ سرائے میر کی صدارت مدرسین مولانا محمد شبلی متکلم کے سپرد ہوئی۔ مدرسہ کی نظامت مسعود علی ندوی نے اپنے سر لی۔ دارالمصنفین کی تشکیل و تاسیس کے لیے اس جماعت کے ارکان نے ماہوار چندے لکھوائے۔ مسعود علی ندوی نے چندوں کی وصولی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور شبلی منزل میں مستقل قیام کیا۔

اس کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین اور سید سلیمان ندوی بھوپال جا کر نواب سلطان جہاں بیگم سے ملے۔[۷۷] سرکارِ عالیہ نے انھیں تسلی دی اور سیرتِ نبوی کی تدوین کے لیے وظیفے کی رقم ان دونوں حضرات کے نام جاری فرما دی۔ اس طرح دارالمصنفین کے وجود و ارتقا کا سامان بہم

پہنچایا۔ مولانا حمید الدین حیدر آباد دکن گئے اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سے مل کر دارالمصنفین کے لیے ماہانہ امداد کی درخواست کی۔ نواب صاحب کی سفارش پر نظام نے شبلی مرحوم کے تین سو روپے ماہوار وظیفے کو دارالمصنفین کے نام منتقل کیا اور اپنی جیبِ خاص سے سالانہ سو روپے کی رقم مختص کی۔ عماد الملک دارالمصنفین کے پہلے صدر نشین تھے۔[۷۸]

نواب سر مزمل اللہ خاں مولانا شبلی کے قدر دان تھے۔ انھوں نے ندوۃ العلماء، علی گڑھ کالج اور دیو بند جیسے اداروں کی مالی امداد کی تھی۔ دارالمصنفین بھی ان سے فیض یاب ہوا۔ آپ نے دارالمصنفین کی مسجد پانچ ہزار کے صرفے سے بنوائی تھی اور دری کا فرش اور مسجد کے لیے پردے بنوا کر بھیجے تھے۔ اسی مسجد کے مشرق میں مولانا شبلی دفن کیے گئے تھے۔[۷۹]

دارالمصنفین اعظم گڑھ کا پہلا جلسہ ۲۵ مئی ۱۹۱۵ء کو منعقد ہوا۔ مولانا شبلی مرحوم اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ علمی مقاصد کی تکمیل کے لیے کاملِ فن اور ایثار پیشہ علما کی ایک ٹیم چھوڑ گئے جس نے ان سے کیے گئے وعدوں کو زندگی بھر نبھایا۔ ۲۵ مئی کے جلسے میں مولانا حمید الدین صدر، سید سلیمان ندوی ناظم، مسعود علی ندوی مینیجر اور حامد نعمانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، نواب سید علی حسن خاں، پروفیسر شیخ عبدالقادر پونا، مولانا عبداللہ عمادی، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی اور عبدالماجد دریابادی ارکان مقرر ہوئے۔ بعد میں سید سلیمان ندوی نے باصرار عبدالسلام ندوی کو ادارے میں شریک کیا۔ ۴ جولائی ۱۹۱۵ء کو مجلسِ دارالمصنفین کا رجسٹریشن کرا لیا گیا۔ سید سلیمان ندوی نومبر ۱۹۱۵ء میں پونا کالج سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ آ گئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

دارالمصنفین کا ابتدائی عملہ پانچ افراد پر مبنی تھا اور یہ افراد مولانا شبلی کے تربیت یافتہ اور شاگرد تھے۔ سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، مسعود علی ندوی، معین الدین ندوی اور ایک مسودہ نویس تھا۔ ان کی تنخواہیں علی الترتیب سو، سو، پچاس، تیس اور بیس روپے ماہوار تھیں۔ دارالمصنفین کے مجوزہ نقشے میں دارالتصنیف، دارالاشاعت، دارالکتابت، علاحدہ پریس کا قیام اور ایک علمی رسالے کا اجرا شامل تھا۔ شعبۂ تصنیف میں اس وقت سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی تھے۔

ان حضرات کی کاوش کا پہلا پھل مکاتیبِ شبلی (حصہ اول) کی صورت میں ۱۹۱۶ء

میں ظاہر ہوا۔ سید سلیمان ندوی ۱۹۰۹ء سے شبلی کے خطوط جمع کر رہے تھے۔ مکاتیب کی پہلی جلد مولانا شبلی دیکھ چکے تھے۔ سید صاحب قیامِ پونا کے زمانے میں ارض القرآن پر کام کر رہے تھے۔ یہ دراصل سیرت النبیؐ کا مقدمہ تھا جو سید صاحب نے مولانا شبلی کے کہنے پر تصنیف کیا تھا۔ اس کی طوالت اور موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے کتابی شکل دی گئی لیکن کچھ حصہ سیرت النبیؐ کا جز بنا۔ اس میں ان قبائل اور اقوام کی تاریخ اور جغرافیہ کا ذکر تھا جن کی قرآنِ کریم میں نشان دہی کی گئی تھی۔

دارالمصنفین کا پریس جون ۱۹۱۶ء میں نصب کیا گیا اور جولائی ۱۹۱۶ء میں رسالہ معارف منظرِ عام پر آیا۔[۸۰] سید صاحب اس رسالے کے چونتیس سال مدیر رہے اور انھوں نے اپنے رفقا کی مدد سے اردو کا دامن تاریخ، مذہب اور ادبیات کے بیش بہا موتیوں سے بھر دیا۔ ۱۹۱۸ء میں جب دارالمصنفین نے سیرت النبیؐ (جلد اول) شائع کی تو سید سلیمان ندوی اسے لے کر والیۂ ریاست بھوپال سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیگم صاحبہ نے دورانِ ملاقات سید صاحب سے دریافت کیا کہ ''عالمِ رویا میں رسولِ انام علیہ السلام کی زیارت کس طرح ہو سکتی ہے؟'' سید صاحب نے جواب دیا ''کتبِ حدیث وسیرۃ کے مطالعے اور درود و سلام کی کثرت سے''۔[۸۱]

ارکانِ دارالمصنفین کی ایثار نفسی کے متعلق سید سلیمان ندوی نے جون ۱۹۲۹ء میں معارف میں لکھا۔

> جہاں تک دارالمصنفین کا تعلق ہے ہم اور ہمارے رفقا نے یہ طے کرلیا ہے کہ کچھ نہ ملنے پر بھی ہم سب کچھ کریں گے اور ایثار و اخلاص کے دعوے کو ان شاء اللہ کبھی شرمندہ نہ ہونے دیں گے۔[۸۲]

معارف کے مطمحِ نظر کے بارے میں سید صاحب نے جولائی ۱۹۲۸ء کے معارف میں تحریر کیا۔

> لفظی اور معنوی حیثیت سے اعتدال، مضامین میں ادبیت بھی ہو منطقیت بھی، تحقیق و کاوش بھی ہو اور حسن و لطافت بھی، شرقیت بھی ہو اور مغربیت بھی۔ جدت بھی ہو اور قدامت بھی۔ فلسفیت بھی ہو اور مذہبیت بھی، عقلیت بھی اور نقلیت بھی۔
>
> یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

> لوگ کہیں گے کہ یہ جمع اضداد ہے، ہم جواب دیں گے کہ معارف کیا خود عالم مجموعۂ اضداد ہے۔[۸۳]

سید سلیمان ندوی کو بحیثیت شاگرد مولانا شبلی سے بے پناہ عقیدت تھی کیوں کہ مولانا نے سید صاحب کے علمی جوہر کا ادراک کیا تھا اور ان کے والد اور چچا سے آبائی پیشہ طب اختیار کرنے کے بجائے تدریس و تعلیم پر زور دیا تھا۔ سید صاحب شبلی کے انتقال کے بعد اپنے استاد کی متعین کردہ علمی روش پر چلتے رہے لیکن بعد میں انھوں نے مختلف علوم میں جو اضافے کیے ان سے سید صاحب کے مرتبے اور علم کا بہتر اظہار ہوا۔

سید صاحب شبلی کی نسبت کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ اس کی بنیادی وجہ دونوں کے مزاجوں کا فرق تھا۔ شبلی سیمابی طبیعت اور جذباتی انداز رکھتے تھے جبکہ سید صاحب متحمل مزاج اور صبر و رضا کے قائل تھے۔ شبلی کی طبع ہمہ جہتی تھی۔ وہ خود کو نمایاں رکھتے اور ان میں قیادت کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ جن اداروں سے وہ برسوں منسلک رہے جب ان سے الگ ہوئے تو انھیں اداروں کی زندگی کے درپے ہوگئے۔ جولائی ۱۹۱۳ء میں جب وہ معاصرینِ ندوہ سے اختلافات کی بنا پر مستعفی ہوئے تو انھوں نے اور ان کے تابعین نے ندوۃ العلماء کے خلاف ملک بھر میں ہنگامہ برپا کیا اور ندوۃ العلما کے وجود کے درپے ہوگئے۔ مسعود علی ندوی علمی شخصیت نہ تھے، نہ ہی غور و فکر اور مآل اندیشی سے انھیں علاقہ تھا لیکن شبلی کی حمایت میں انھوں نے ندوہ میں ہڑتال کی اور مولانا شبلی کی اخلاقی حیثیت کو مجروح کیا۔

اس کے برعکس مولانا سید سلیمان ندوی نے بتیس سال کی رفاقت اور دارالمصنفین کی رہنمائی کے بعد جب ان کے اور مسعود علی ندوی کے درمیان اختلافات بڑھ گئے اور مسعود صاحب نے سید صاحب کا رہنا دوبھر کر دیا تو جون ۱۹۴۶ء میں آپ دارالمصنفین سے خاموشی سے الگ ہو گئے۔ نواب صاحب بھوپال کے اصرار پر آپ نے قاضی القضاۃ ریاست اور امیر جامعہ کا عہدہ قبول کیا۔ الگ ہونے کے باوجود آپ نے ادارے سے تعلق ختم نہ کیا اور اس کی بہبود کے لیے ہدایات دیتے رہے۔[۸۴]

مولانا شبلی کی سیمابی طبیعت ان کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بنی۔ ۱۹۱۲ء میں جب آپ نے سیرتِ نبوی کا عظیم الشان منصوبہ شروع کیا تھا تو اس وقت مولانا کی صحت اچھی نہ تھی اور انھیں اندازہ تھا

کہ ان کے پاس فرصتِ زیست کم رہ گئی تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے کہنے میں آکر خود کو سیاسی مباحث میں الجھایا اور مسلم لیگ کی روش اور علی گڑھ تحریک سے آویزش کی راہ اپنائی۔ شبلی ہنگامی سیاست کے لیے موزوں نہ تھے، ان کے لیے بہترین راہِ عمل وہی تھی جو انھوں نے مولوی محمد اسحٰق کے انتقال کے بعد اپنائی۔ یعنی ہم خیال علما کو ساتھ لے کر مشترکہ علمی مساعی اور علمی ادارے کا قیام۔

سید سلیمان ندوی کو علم تھا کہ وہ عملی سیاست کے لیے موزوں نہ تھے، چنانچہ انھوں نے مختصر عرصے کے لیے قومی کاموں میں دخل دیا۔ مثلاً ۱۹۲۰ء کے وفدِ خلافت میں شمولیت اور یورپ میں قیام کیا یا ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء میں حجاز کے معاملات کی درستی کے لیے جدو جہد کی لیکن اس میں بھی کسی مرحلے پر علم جوئی اور عالمانہ وقار کو ترک نہ کیا اور دارالمصنفین اور ندوۃ العلما سے وابستہ رہ کر علم کی خدمت کرتے رہے۔

حوالہ جات

٭ محقق و مصنف، ایم اے ایریا اسٹڈیز: جنوبی ایشیا، سواس لندن یونی ورسٹی، مقیم کراچی۔

۱۔ شیخ محمد اکرام، یادگارِ شبلی (لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۷۱ء)، ص ۲۵۹۔۲۶۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۴۔

۳۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی (اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اکتوبر ۲۰۰۸ء)، ص ۵۰۵۔۵۰۶۔

۴۔ الناظر، لکھنؤ، مارچ ۱۹۱۰ء، ص ۱۳، بحوالہ یادگارِ شبلی، ص ۲۶۸۔۲۷۰۔

۵۔ عبدالماجد دریابادی، معاصرین (کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام)، ص ۲۸۔۲۹۔

۶۔ سید سلیمان ندوی، یادِ رفتگاں (کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۲۱۔۱۲۲۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔۲۰۶۔

۸۔ خلیق انجم، مرتب، سید سلیمان ندوی (دہلی: انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۸۶ء)، ص ۱۲۷۔۱۲۸۔

۹۔ سید ابوالحسن علی ندوی، حیاتِ عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ (کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام ۱۹۸۵ء)، ص ۱۳۳۔۱۳۶۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۱۱۔ یادِ رفتگاں، ص ۱۵۷۔

۱۲۔ حیاتِ عبدالحئی، ص ۱۵۲۔۱۵۳۔

۱۳۔ یادِ رفتگاں، ص ۱۵۷۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۲۹۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۲۳۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۹۔

۱۷۔ حیاتِ شبلی، ص ۳۱۱۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۱۴۔۳۱۵۔

۱۹۔ حیاتِ عبدالحئی، ص ۱۵۹۔۱۶۰۔

۲۰۔ حیاتِ شبلی، ص ۲۹۸۔

۲۱۔ یادگارِ شبلی، ص ۲۹۷۔۲۹۸۔

۲۲۔ سید سلیمان ندوی، مرتب، مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم (کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۴۱۔

۲۳۔ یادِ رفتگاں، ص ۳۲۳۔۳۲۴، ۱۴۰۔

۲۴۔ حیاتِ شبلی، ص ۳۳۸۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۶۱۔۳۶۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۵۲۔۳۵۴۔

۲۷۔ یادِ رفتگاں، ص ۱۱۹۔

۲۸۔ حیاتِ شبلی، ص ۳۵۵۔

۲۹۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، ص ۲۲۔

۳۰۔ حیاتِ شبلی، ص ۳۸۴۔

۳۱۔ سید سلیمان ندوی، مرتب، مکاتیبِ شبلی، حصہ اول (لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء)، ص ۲۱۵۔

۳۲۔ یادگارِ شبلی، ص ۳۰۸۔۳۰۹۔

۳۳۔ حیاتِ شبلی، ص ۳۷۶۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۵۹۔۳۶۰۔ یادِ رفتگاں، ص ۲۰۳۔

۳۵۔ حیاتِ شبلی۔ ص ۵۴۳۔

۳۶۔ سید سلیمان ندوی، سیرتِ عائشہ (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۲۰۰۶ء)، ص ۸۔۱۱۔

۳۷۔ حیاتِ شبلی، ص ۳۴۶۔۳۴۷۔

۳۸۔ یادِ رفتگاں، ص ۷۔۱۷۔

۳۹۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۴۱۔۵۴۳۔

۴۰۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، ص ۲۱۵۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۱۷۔

۴۲۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۴۳۔۵۴۶۔

۴۳۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، ص ۲۴۰۔

۴۴۔ معاصرین، ص ۲۹۔

۴۵۔ یادِ رفتگاں، ص ۱۴۲۔

۴۶۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۰۱۔

۴۷۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، ص ۲۲۵۔۲۲۷۔

۴۸۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۴۸۔

۴۹۔ سید سلیمان ندوی، ص ۱۰۱۔۱۰۲۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۹۲۔

۵۱۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، ص ۹۲۔

۵۲۔ سید سلیمان ندوی، ص ۱۰۴۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۵۴۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، ص ۱۰۳۔

۵۵۔ یادِ رفتگاں، ص ۴۴۲۔۴۴۴۔

۵۶۔ حیاتِ عبدالحئی، ص ۱۶۷۔۱۶۸۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔

۵۸۔ حیاتِ شبلی، ص ۴۹۶۔۴۹۷۔

۵۹۔ حیاتِ عبدالحئی، ص ۱۸۰۔۱۸۱۔

۶۰۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۰۲۔۵۰۳۔

۶۱۔ حیاتِ عبدالحئی، ص ۱۸۲۔

۶۲۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، ص ۱۴۲۔

۶۳۔ یادگارِ شبلی، ص ۴۱۱۔۴۱۲۔

۶۴۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، ص ۱۴۲۔۱۴۳۔

۶۵۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۰۴۔۵۰۷۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۵۰۶۔۵۰۸

۶۷۔ یادگارِ شبلی، ص ۴۱۴۔۴۱۵۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۰۸۔۵۱۰۔

۶۸۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، ص ۱۵۴۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۵۹۔

۷۰۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۱۸۔۵۱۹۔

۷۱۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، ص ۱۳۷۔۱۳۸۔

۷۲۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۱۹۔

۷۳۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ دوم، ص ۱۱۵۔۱۱۶۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۵۲۔۵۳۔

۷۵۔ مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، ص ۲۶۶۔

۷۶۔ حیاتِ شبلی، ص ۵۵۴۔۵۵۵۔

۷۷۔ یادِ رفتگاں، ص ۱۴۳۔۱۴۵۔

۷۸۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔

۸۰۔ سید سلیمان ندوی، ص ۱۵۹۔۱۶۰۔

۸۱۔ یادِ رفتگاں، ص ۱۰۴۔

۸۲۔ سید سلیمان ندوی، ص ۱۵۴۔

۸۳۔ ایضاً، ص ۱۵۰۔

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۶۲۔۱۶۳۔

مآخذ

اکرام، شیخ محمد۔ یادگارِ شبلی۔ لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ۱۹۷۱ء۔

انجم خلیق۔ مرتب سید سلیمان ندوی۔ دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۶ء۔

دریابادی، عبدالماجد۔ معاصرین۔ کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام۔

ندوی، سید ابوالحسن علی۔ حیاتِ عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ۔ کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام ۱۹۸۵ء۔

ندوی، سید سلیمان۔ حیاتِ شبلی۔ اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اکتوبر ۲۰۰۸ء۔

________۔ سیرتِ عائشہ۔ لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ ۲۰۰۶ء۔

________۔ مرتب مکاتیبِ شبلی۔ حصہ اول۔ لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء۔

________۔ مرتب مکاتیبِ شبلی۔ حصہ دوم۔ کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء۔

________۔ یادِ رفتگاں۔ کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام ۱۹۸۳ء۔